طلوعِ اسلام

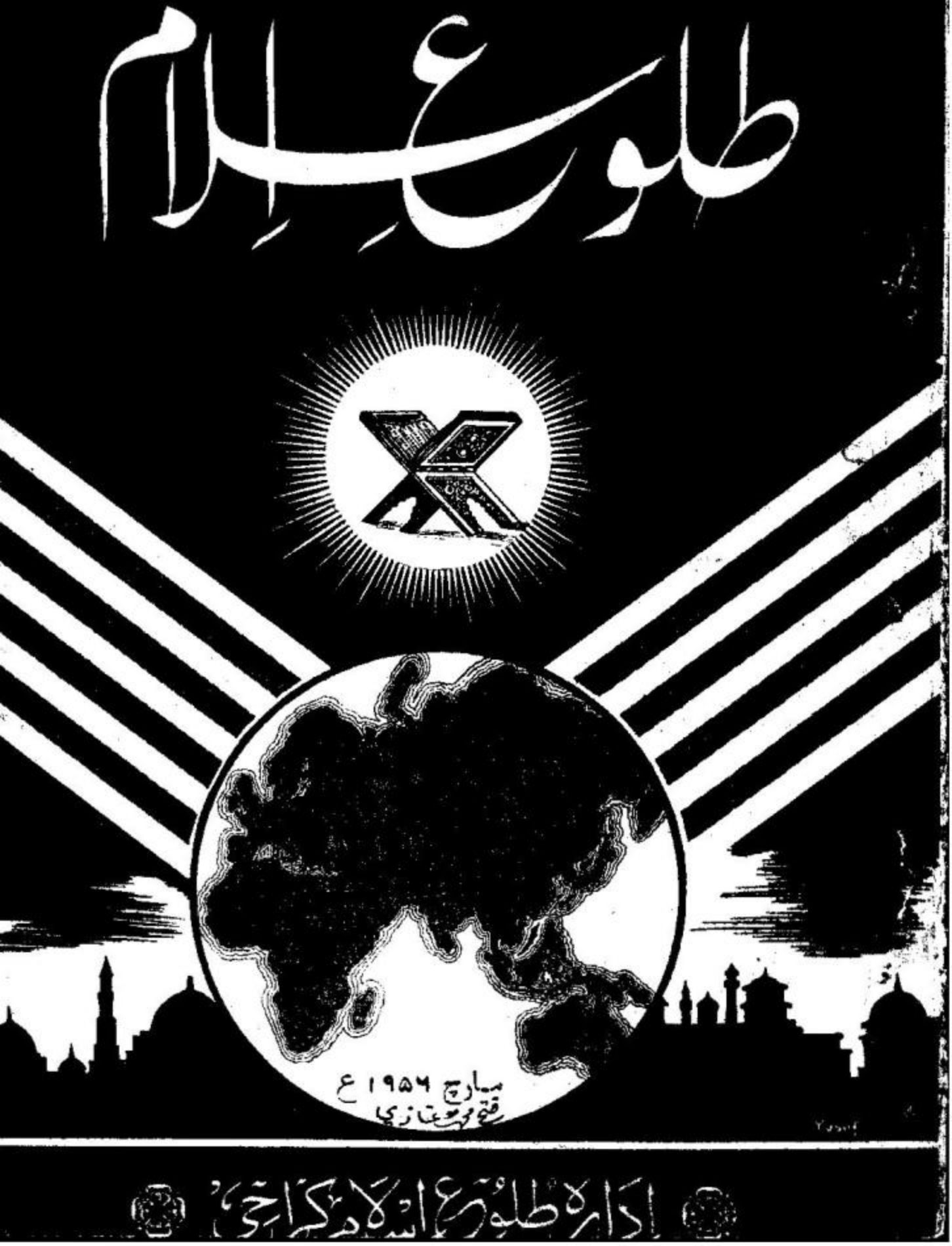

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدل اشتراک
سالانہ آٹھ روپے
(ہندوستان سے) سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۲۰ شلنگ

قیمت فی پرچہ
پاکستان سے بارہ آنے
ہندوستان سے بارہ آنے

جلد ۹ | مارچ سنہ ۱۹۵۶ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

لمعات	۳ — ۱۰
عائلی زندگی	۱۱ — ۳۱
یاد ایامیکہ....	۳۲ — ۳۵
حقائق وعبر	۳۶ — ۴۲
مجلس اقبال	۴۳ — ۴۹
اسلام کی سرگذشت	۵۰ — ۵۹
باب المراسلات	۶۰ — ۶۲
نقد ونظر	۶۳ — ۶۶
اشتہارات	

جوئے نور

(از پرویز)

سلسلہ معارف القران کی دوسری کڑی

جو حضرات انبیاء کرام کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے - جس میں حضرت نوح سے لیکر حضرت شعیب تک تمام انبیاء کرام علیہم التحیۃ و السلام کا تذکرہ آگیا ہے - یہ کتاب محترم مصنف جناب پرویز کی نظر ثانی کے بعد دوسری مرتبہ شائع کی گئی ہے جو پہلے معارف القرآن جلد سوم کا ایک حصہ تھی اس کا سائز بھی وہی ہے جو "ابلیس و آدم" کا سائز تھا یعنی $\frac{۲۹ \times ۲۲}{۸}$ ضخامت ۳۰۴ صفحات -

کتاب کرنا فلی گلیزڈ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے - کتابت و طباعت دیدہ زیب اگر آپ نے ابتک آرڈر نہیں دیا تو جلدی کیجئے کیونکہ کتاب اس ترتیب کے ساتھ روانہ کی جائے گی جس ترتیب سے اس کے آرڈرز موصول ہوں گے - پیشگی خریداروں کو آرڈر بھیجنے کی ضرورت نہیں - کتاب حسب ترتیب رفتہ رفتہ ان کی خدمت میں خود ہی پہنچ جائے گی - البتہ جو حضرات یہ کتاب نہ منگانا چاہیں وہ فوراً اطلاع دیدیں -

قیمت مجلد مع گرد پوش چھ روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

پوسٹ بکس ۷۳۱۳ ، صدر ، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملت

فروری کے یہ تین ہفتے مجلس دستور ساز میں، مسودۂ آئین پاکستان پر بحث و تمحیص میں گذر گئے۔ اس حقیقت کے اعتراف اور اظہار سے تاسف بھی ہوتا ہے اور ندامت بھی کہ بحث کی سطح ایسی رہی جس سے ہم دنیا والوں کی نگاہوں میں کوئی اونچا مقام نہیں حاصل کر سکے۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی قوم پستی کی طرف جا رہی ہو تو وہ کسی ایک شعبۂ زندگی ہی میں پست نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی کی پوری سطح پست ہو چکی ہوتی ہے۔ اور اس کا مظاہرہ ہر گوشۂ حیات پر ہوتا رہتا ہے۔ اس بحث میں یوں تو قریب قریب ہر موقع پر کوئی نہ کوئی تعجب انگیز اور مضحکہ خیز بات سامنے آتی رہی لیکن جب کوئی معاملہ اسلام سے متعلق زیر بحث آیا تو اس وقت جس قسم کی جہالت، یا معکوس ذہنیت کا مظاہرہ ہوا، وہ ہر قلب حساس کے لئے موجب ہزار عبرت تھا۔ اس سے صاف نظر آ گیا کہ جب تک ہمارے ارباب سیاست کی زبان پر اسلام کا نام بطور ایک سلوگن کے رہتا ہے، ان کا بھرم بنا رہتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی موقع پر اس کی نقطہ کی وضاحت پر مجبور ہو جاتے ہیں تو اس وقت وہ اس قسم کی بولیاں بولتے ہیں جس سے انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کیا یہ لوگ، اسلام کا نام لیوا ہونے کے باوجود، اس کی اصل و بنیاد سے اس درجہ ناواقف ہیں؟ اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس جہالت میں یہ آگے ہیں یا ہمارا ملا! مثلاً مرکزی کابینہ کے ایک وزیر نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور جمہوریت کے معنی ہیں اکثریت کی حکومت۔ یہ کچھ انہوں نے ایوان اسمبلی میں کہا اور عین اسی دن محترم گورنر جنرل صاحب نے مشرقی بنگال میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ آواز خلق در حقیقت خدا کی آواز ہوتی ہے اور کوئی اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتا۔

مغربی جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ باتیں بڑی معقول نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں اصول یہ ہے کہ اکثریت جو فیصلہ کر دے وہی حق ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم اسلام کے زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تو یہ مسلمہ تار عنکبوت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک حق اور باطل کا معیار اکثریت یا اقلیت کے فیصلے نہیں۔ اس کے لئے ایک مستقل معیار ہے جو اپنی جگہ ہمیشہ اٹل رہتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حق ہمیشہ حق ہوتا ہے خواہ اس کی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے اور باطل ہمیشہ باطل ہوتا ہے خواہ

اس کی موافقت میں سو فی صدی ہاتھ بھی کیوں نہ بلند ہو جائیں۔ اگر ہم اس اصول کو صحیح تسلیم کر لیں کہ اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ حق ہوتا ہے اور خلقت کی آواز، خدا کی آواز ہوتی ہے۔ تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ (مثلاً) روس والوں کا یہ دعویٰ کہ خدا کا تصور یونہی ذہنِ انسانی کا تراشیدہ اور سرمایہ داروں کا فریب ہے، درست اور صحیح ہے۔ اس لئے کہ وہاں کی بہت بڑی اکثریت کا یہی فیصلہ ہے اور ان کے جمہور کے حلق سے یہی آواز بر آمد ہوتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہندوؤں کا یہ فیصلہ کہ کشمیر پر قبضہ جما لینا ان کا حق ہے صحیح اور درست ہے کیونکہ وہاں کی اکثریت کا یہی مطالبہ ہے۔ اس سے بھی نزدیک تر خود اپنے گھر کی طرف آئیے۔ آپ آئے دن اس کا رونا روتے رہتے ہیں کہ یہاں کی بیشتر آبادی اخلاقی حیثیت سے بہت پست ہو چکی ہے۔ دیانت کہیں نام کو نہیں رہی۔ رشوت (لینے اور دینے) کی گرم بازاری ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے پڑا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو کیا (آپ کے اس اصول کے مطابق کہ اکثریت ہمیشہ سچائی پر ہوتی ہے) یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بد دیانتی اور بد اخلاقی حق و صداقت کا مسلک ہے؟

اصل یہ ہے کہ ہماری تاریخ میں یہ نعرہ اس وقت بلند ہوا جب ملوکیت کے استبداد نے عوام کی اکثریت کو اپنے تابع فرمان کر لیا۔ (جیسا کہ اس زمانے میں عام طور پر ہوتا تھا) اس کی تائید میں ایک روایت بھی وضع کر لی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ میری اُمت کا سوادِ اعظم کبھی گمراہی پر جمع نہ ہوگا۔ اس سے ہر اس شخص کے ہاتھ خدائی سند آ گئی جو کسی نہ کسی طرح اکثریت کو اپنے ساتھ ملا لے۔ دوسری طرف چونکہ اہلِ مذہب کے پاس حق و باطل کا کوئی مستقل معیار نہیں تھا اس لئے انہوں نے (مجبوراً) یہ فیصلہ کیا کہ اکثریت جس طرف جائے اس کو حق سمجھ لینا چاہیئے۔ اسے جمہوری اندازِ حکومت کہتے ہیں۔ جو درحقیقت ملوکیت کی شخصی حکومت کا ردِ عمل تھا۔ اس طرح ہمارے ہاں "دین دار" اور "دنیا دار" دونوں طبقوں نے یہ سمجھ لیا کہ اکثریت ہمیشہ حق پر ہوتی ہے۔ اب ہمارے اربابِ سیاست، اس خیال سے کہ ہم اپنی قوت و دولت کی بنا پر عوام کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ جمہور کی آواز حق کی آواز ہے۔ اور مذہب پرست طبقہ، اس زعم میں کہ ہم نے "خدا اور رسول" کے نام پر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے، اس کا اعلان کر رہا ہے کہ جمہور کے مطالبہ کو ماننا نہایت ضروری ہے۔ اور اسلام بیچارا ان دونوں کے درمیان کھڑا، رہ رہ کر آسمان کی طرف تکتا اور کہتا ہے کہ

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

یاد رکھئے۔ اسلام کی رُو سے حق اور باطل کے پرکھنے کا معیار ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے خدا کی زندہ و پائندہ کتاب جسے اس نے الفرقان کہا ہے۔ یعنی حق و باطل میں فرق کر دینے والی۔ لہٰذا، ہمارے ہاں جمہوریت یا شورائیت ہمیشہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگی کہ ہمارا کوئی فیصلہ کتاب اللہ سے متصادم نہ ہو۔

اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ صدرِ مملکت کو بالضرور مسلمان ہونا چاہیئے، وزیر موصوف نے کہا کہ بات محض (SYMBOLIC) ہے

اطمینان کے جمہوری انداز پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔

یہ چیز بھی اصولاً غلط ہے۔ ایک اسلامی مملکت میں، صدر مملکت کا مسلمان ہونا، محض رسمی یا علامتی شے نہیں بلکہ اس محکم اصول کا عملی ثبوت ہے جس پر اسلامی نظام کا مدار ہے۔ اسلامی نظام آئیڈیالوجی پر مبنی ہے اس لئے اس میں کوئی ایسا شخص شریک حکم نہیں ہو سکتا جو اس آئیڈیالوجی کو نہ مانتا ہو۔ ہمیں اس حقیقت کے اعلان میں کسی قسم کی جھجک یا احساسِ ندامت نہیں ہونا چاہیئے۔

انہوں نے اپنے دعوے کی دلیل میں (کہ صدر مملکت کو مسلمان ہونا چاہیئے) یہ بھی کہا کہ انگلستان، ڈنمارک، سویڈن وغیرہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ صدر مملکت کے لئے کسی خاص مذہب کا پیرو ہونا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ ہم ان ممالک کو بطور نظیر تو پیش کر سکتے ہیں لیکن بطور دلیل نہیں۔ اس لئے کہ اگر کل کو یہ ممالک فیصلہ کر لیں کہ صدر مملکت کے لئے کسی خاص مذہب کے اتباع کی شرط نہیں، تو کیا اس وقت آپ بھی یہ فیصلہ کر لیں گے کہ اسلامی مملکت میں صدر مملکت کا مسلمان ہونا ضروری نہیں؟ یا مثلاً اگر آج دنیا کے کسی ملک میں ہمیں اس کی مثال نہ ملتی تو کیا ہم یہ فیصلہ کرتے کہ صدر مملکت کے لئے مسلمان ہونے کی شرط نہیں؟ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، ان امور کے فیصلے کے لئے ہمارے پاس مستقل معیار ہے۔ لہٰذا ہمیں ان باتوں کے متعلق گفتگو کرتے وقت ہمیشہ اس معیار کو بطور دلیل پیش کرنا چاہیئے اور باقی چیزوں کو محض تائیداً بطور نظیر۔

اسلام اور اس کے تضمنات کے سلسلہ میں، حزبِ مخالف کے لیڈر، مسٹر سہروردی نے جو کچھ کہا اور جس انداز سے کہا، وہ فی الحقیقت بڑا تاسّف انگیز اور تکلیف دہ تھا۔ طلوع اسلام کو موافق اور مخالف پارٹیوں میں سے کسی سے بھی کچھ تعلق نہیں اس لئے نہ اس کی کسی سے موافقت کسی جنبہ داری کی بنا پر ہوتی ہے نہ مخالفت تعصب کی بنا پر۔ یہ جس بات کو غلط سمجھتا ہے اسے غلط کہتا ہے خواہ وہ کسی کی زبان سے نکلے۔ اس بنا پر، حزبِ مخالفت کے متعلق اس کی یہ تنقید بھی اسی اصول کے تابع ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس جماعت نے اس بحث کے دوران میں جس تعلیمی و ذہنی سطح کا ثبوت دیا ہے وہ ملک کے سنجیدہ طبقہ کے لئے بڑی کوفت کا موجب ہوئی ہے۔ اس کے بعد خود اس جماعت کے لیڈر (مسٹر سہروردی) جس حد تک چلے گئے، وہ اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ البتہ اس ضمن میں، انہوں نے دو ایک باتیں ایسی بھی کہی ہیں جن کی تائید نہ کرنا بعید از انصاف ہوگا۔ (ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ انہوں نے یہ کچھ محض "بطور بغضِ معاویہ کہا یا بحُبِّ علی" ہم صرف ان باتوں کا ذکر کر رہے ہیں جو انہوں نے اس سلسلہ میں کہی ہیں) انہوں نے کہا کہ تم ایک طرف یہ کہتے ہو کہ اس امر کا آخری فیصلہ کہ قرآن و سنت کا حکم کیا ہے، ملک کی مقننہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور دوسری طرف تم علماء کو یہ حیثیت دے رہے ہو کہ وہ متعین کریں کہ کون کون سے امور قرآن و سنت کے مطابق ہیں اور کون کون سے ان کے خلاف۔ اب اگر ایسا ہوا کہ جس بات کو علماء نے قرآن و سنت کے خلاف قرار دیا تھا، مقننہ نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا تو یہ علماء ملک میں شور مچا دیں گے کہ دیکھو! یہ افرنگ زدہ، بے دین اکٹھے ہو کر خدا اور رسول کے حکم کے خلاف قانون بنا رہے ہیں؟ ہمارے ملک کے عوام پر ان علماء کا بڑا اثر ہے اور ان میں مذہبی جنون کی بھی کمی نہیں۔ ان حالات میں، یہ لوگ ملک میں جس قسم کا انتشار پھیلانے کا موجب بن سکتے ہیں اس کی روک تھام کی کیا تدبیر

ہوگی؟

یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے جس کی طرف ہم ارباب بست وکشاد کی توجہ ایک عرصہ سے مبذول کراتے چلے آرہے ہیں کہ وہ مقبولیت عامہ حاصل کرنے کیلئے آگ سے کھیل رہے ہیں۔ بات بڑی صاف ہے۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ کسی گورنر جنرل کے بیٹے کی شادی ہو یا کسی وزیر اعظم کی لڑکی کا بیاہ۔ نکاح کے لئے کسی مولوی صاحب ہی کو بلایا جاتا ہے۔ اب کل کو اگر ہماری مجلس قانون ساز میں نکاح وطلاق کے متعلق کوئی مسودۂ قانون پیش ہوا تو کیا یہی مولوی صاحبان یہ نہیں کہیں گے کہ تمہیں خود تسلیم ہے کہ تم اپنے آپ کو اسلامی طریق کے مطابق نکاح پڑھانے کے بھی اہل نہیں سمجھتے تو آپ اس کی جرأت کس طرح کر سکتے ہیں کہ نکاح وطلاق کے متعلق ہمارے فیصلے کے خلاف اسلامی قوانین مرتب کرلیں؛ وہ بھی ہمارا کام تھا۔ یہ بھی ہمارا ہی کام ہے۔ آپ کا کام ان قوانین کو نافذ کرنا ہے نہ کہ انہیں وضع کرنا۔ آپ غور کیجئے کہ ان حضرات کی یہ دلیل کس قدر وقیع ہے۔ لہٰذا جب تک آپ پیشوائیت کی انسٹی ٹیوشن (INSTITUTION) کو جو اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودہ ہے، جڑ بنیاد سے نہیں اکھیڑ دیتے، آپ قرآن وسنت کے مطابق نظام قائم ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے لئے کسی بڑے سول گردہ والے انسان کی ضرورت ہے۔

عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد ہے

دوسری بات مسٹر سہروردی نے یہ کہی کہ تم ایسی مملکت کو اسلامی مملکت کس طرح کہہ سکتے ہو جس میں افراد مملکت بھوکے مرتے ہوں۔ جس میں نہ ان کے لئے کپڑے کا انتظام ہو نہ رہنے کا۔ نہ ان کے بچوں کو تعلیم ملے نہ ان کی صحت کا کسی کو خیال ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں، حزب مخالف کے ایک ممبر کی طرف سے یہ ترمیم بھی پیش ہوئی کہ

> پاکستان کا ہر شہری، خوراک۔ لباس۔ مکان۔ طبی امداد اور روزگار کا مطالبہ بطور استحقاق کر سکتا ہے۔

اس ترمیم کو مسترد کرتے ہوئے مسٹر چندریگر نے جو کچھ کہا اس سے ہمیں افسوس ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ حزب مخالف نے آئین سازی کو مذاق سمجھ رکھا ہے۔ اسلام مسلمانوں کو اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ وہ جھوٹے وعدے کریں۔ وہ مسلمانوں سے یہی کہتا ہے کہ وہ حسب استطاعت کوشش کریں۔ لہٰذا ان مطالبات، کو بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے کہ ایک اسلامی مملکت جو کچھ کرے گی علیٰ قدر وسعت ہی کرے گی۔ اگر وہ اس سے زیادہ کا وعدہ کرتی ہے تو اسے فریب دہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا، ایک اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے یا ثانوی مقصد؟ مثلاً عدل کرنا اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ یعنی اگر وہ مملکت عدل نہیں کرتی تو وہ اسلامی کہلا ہی نہیں سکتی۔ اس کے وجود کا جواز محدل گستری ہے۔ لہٰذا آپ ایک اسلامی مملکت کے آئین میں یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ مملکت کوشش کرے گی کہ حتی الامکان (یا علیٰ قدر وسعت) عدل کرے۔ آپ کو یہ کہنا ہوگا کہ عدل کرنا مملکت کا بنیادی فریضہ ہے اور اگر مملکت اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں قاصر رہے تو اس کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کی جا سکتی ہے جو پوزیشن ایک اسلامی مملکت میں عدل کی ہے بعینہٖ وہی پوزیشن افراد کی

ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے اسباب و ذرائع کی فراہمی کی آئے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہوگا کہ مملکت اس کے لئے حتی الامکان کوشش کرے گی۔ یہ چیز ازروئے قرآن، اس مملکت کا بنیادی فریضہ اور ذمہ داری ہے جو اپنے آپ کو خدائے رب العالمین کی طرف منسوب کرتی ہے۔

انتخاب کا مسئلہ ویسے کا ویسا ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ برسرِ اقتدار پارٹی کا (مشرقی بنگال کے عنصر کو چھوڑ کر) یہ خیال ہے کہ انتخابات جداگانہ ہونے چاہئیں۔ ان کا یہ موقف اسلام کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جداگانہ انتخاب، اسلامی تعلیم کی روح کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر اس پارٹی کے موقف کو من حیث الکل دیکھا جائے تو بڑی متناقض صورت سامنے آتی ہے۔ جداگانہ انتخاب کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کی رُو سے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہندو، مسلمانوں کے نمایندہ کے انتخاب میں حصہ لے سکے؟ بجا اور درست۔ لیکن، اسی پارٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ مجالس مقننہ صدرِ مملکت کا انتخاب کریں گی جو بہرحال مسلمان ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان مجالس میں ہندو (اور دیگر غیر مسلم) اراکین بھی ہوں گے۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غیر مسلم، مسلمان صدرِ مملکت کے انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے تو وہ ایک عام رکن (ممبر) کے انتخاب میں کیوں حصہ نہیں لے سکتا۔ نیز اگر غیر مسلم اراکین "قرآن و سنت" کے مطابق قوانین مرتب کرنے کے کام میں شریک ہو سکتے ہیں تو وہ مسلمان نمایندوں کے انتخاب میں کیوں شریک نہیں ہو سکتے؟ یہ ہیں وہ سوالات جو برسرِ اقتدار پارٹی کے موقف کی کمزوری کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ بنابریں، معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ

(۱) اگر غیر مسلم اراکین مسلمان صدرِ ریاست کے انتخاب اور اسلامی قوانین کی ترتیب و تدوین میں حصہ لینے کے مجاز ہیں تو انہیں مسلمان نمایندے چننے کے لئے بھی مجاز قرار دینا چاہیئے۔ یعنی انتخابات مخلوط ہونے چاہئیں۔

(۲) اور اگر ایک غیر مسلم کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی مسلمان نمایندے کے انتخاب میں حصہ لے سکے تو اسے اس کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ مسلم صدرِ ریاست کے انتخاب یا اسلامی قوانین کی تدوین کے کام میں حصہ لے سکے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، ہمارے نزدیک یہ دوسری صورت ہی اسلامی تعلیم کی منشاء کے مطابق ہے۔ برسرِ اقتدار پارٹی کا

منکر مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن

کا مسلک، نہ اسلامی تعلیم کے مطابق ہے اور نہ ہی معقولیت پر مبنی۔ آپ حیران ہوں گے کہ اتنے اہم مسئلہ کے متعلق ہمارے علمائے کرام کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا! وہ (وہ برسرِ اقتدار پارٹی کی ہم نوائی میں) جداگانہ انتخاب پر تو زور دے رہے ہیں لیکن ان کے اس فیصلہ کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے کہ غیر مسلم اراکین مسلم صدرِ ریاست کے انتخاب اور اسلامی قوانین کی تدوین میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اس وقت ان کی پوری مساعی حسنہ اس "جہادِ عظیم" میں صرف ہو رہی ہیں کہ برسرِ اقتدار پارٹی نے جو مسودہ مرتب کر دیا ہے اسے منظور کر لیا جائے۔ حالانکہ اس میں کئی ایک امور ایسے ہیں جنہیں یہ حضرات خود غیر اسلامی قرار دیا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کے خلاف بھی ان کی طرف سے اعتراض نہیں ہوا! اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ جب مولوی صاحبان کے لئے آئین میں اس قسم

کی جا ذ بیتیں موجود ہوں کہ زکوٰۃ اور اوقاف کا روپیہ مذہبی امور پر صرف کیا جائے گا۔ اسلامیات کے متعلق ایک ادارہ قائم کیا جائیگا جس کے لئے عوام پر خصوصی ٹیکس لگایا جائے گا۔ قانون سازی کے سلسلہ میں ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو اسلامی احکام کی فہرستیں مرتب کریگا۔ تو پھر اس آئین کی کسی شق کو "قرآن و سنت" کے خلاف قرار دینا سراسر حماقت ہے۔ اس سے یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آجائے گی کہ مسلمانوں کی تاریخ میں غیر اسلامی قوانین و احکام کس طرح عین مطابق اسلام قرار پاجایا کرتے تھے؛

"قرآن و سنت" سے متعلقہ دفعات قریب قریب اسی شکل میں منظور کرلی گئی ہیں جس میں یہ مسودہ میں رکھی گئی تھیں۔ اس پر مُلّا شادیانے بجا رہا ہے کہ ہم نے بہت بڑا میدان مار لیا۔ ارباب بست وکشاد کا طبقہ خوش ہے کہ ہم نے مقبولیت عامہ حاصل کرلی لیکن جن کی نگاہیں مستقبل پر ہیں انہیں صاف نظر آرہا ہے کہ اس سے ملک میں اس قسم کا انتشار پیدا ہوگا جس سے کچھ بعید نہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ مملکت سیکولرازم کے آغوش میں چلی جائے۔ پاکستان میں مسلمانوں کی بیشتر آبادی فقہ حنفی کی پابند ہے اور معلوم ہے کہ فقہ حنفی میں کئی احکام ایسے ہیں جو کم از کم "سنت" (یعنی احادیث) کے خلاف ہیں۔ اس وقت تو حنفی علماء سب خاموش ہیں لیکن سوچئے کہ جب کل کو کوئی ایسا قانون بن گیا جو فقہ حنفی کے خلاف ہوا تو اس وقت کیا صورت پیدا ہوگی؟ کئی امور ایسے ہیں جو "قرآن" کے خلاف ہیں لیکن "سنت" کے مطابق ہیں۔ یا قرآن کے مطابق ہیں اور "سنت" کے خلاف ہیں۔ (مثلاً غلامی کی تنسیخ اور مسلمان کے لئے تبدیلیٔ مذہب کی اجازت، قرآن کے مطابق ہے لیکن "سنت" کے خلاف ہے اور اس باب میں تو اہل حدیث وغیرہ سب متفق ہیں۔ حتیٰ کہ مودودی صاحب نے اس باب میں صفحوں کے صفحے کالے کر ڈالے تھے۔ لیکن اب وہ بھی خاموش ہیں) تو ایسی صورتوں میں کیا ہوگا؟ ہوگا یہ کہ ملک میں انتشار پھیل جائے گا اور نوجوان طبقہ سرے سے دین سے بیزار ہو جائے گا۔

ملک کا سرمایہ دار طبقہ عوام کو غریب سے غریب تر کر کے کمیونزم کے لئے فضا سازگار بنا رہا ہے اور ارباب اقتدار اس قسم کے آئین و قوانین سے لادینی کو دعوت دے رہے ہیں اور کسی کو اس کی پرواہ نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ بہرحال ہم ملک کی مختلف جماعتوں سے درخواست کریں گے کہ جب یہ آئین منظور ہو چکا ہے تو وہ اس کے راستے میں روڑے نہ اٹکائیں بلکہ اس کے چلانے میں ہر طرح سے تعاون کریں۔ تجربہ اس کی خامیوں کو خود بخود دور کرتا جائے گا۔

(۲)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ارباب حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس قسم کے اعلانات ہوتے رہتے ہیں کہ ملک میں بہت سے غدار افراد اور پارٹیاں موجود ہیں۔ لوگوں کو ان سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ حکومت ایسے افراد اور پارٹیوں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرے گی۔ اس قسم کے اعلانات کا سلسلہ تشکیل پاکستان کے فوری بعد شروع ہو گیا تھا اور اب تک جاری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ نہ تو لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں فلاں افراد یا پارٹیاں غدارِ وطن ہیں اور نہ ہی یہ حقیقت منظرِ عام پر آئی ہے کہ فلاں فرد یا پارٹی کے خلاف غداری کے جرم میں کوئی کارروائی کی گئی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے ملک کے وفا شعار باشندے کس مشکل میں الجھ جاتے ہیں؟ ان کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سے افراد یا جماعتیں غدارانِ وطن ہیں اور کون سے ایسے نہیں۔ ان حالات میں (ظاہر ہے کہ) وہ محتاط میں لگن سے رہیں؟ اس بناء پر ہم نے کئی مرتبہ یہ گذارش کیا تھا کہ ارباب حکومت کو چاہیئے کہ وہ واضح الفاظ میں بتایا کریں کہ فلاں افراد یا جماعتیں

غداران وطن ہیں تاکہ ہر وفا شعار ان سے کنارہ کش ہو جائے۔ مملکت پاکستان سے غداری اور استحکام پاکستان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی ایسا سنگین جرم ہے جس کا انکشاف عام ہونا چاہیئے۔ اسی سے اس فتنہ کا استیصال ہو سکے گا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ایسے اہم مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور اس قسم کے اعلانات پھر ویسے ہی مبہم الفاظ میں کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں محترم گورنر جنرل نے اپنی مشرقی بنگال کی ایک تقریر میں فرمایا کہ

> ملک میں ایسی جماعتیں بھی ہیں جو اس پست سطح پر پہنچ چکی ہیں کہ وہ بیرونی جماعتوں سے ساز باز رکھتی ہیں اور انہیں اپنے ملک کے خلاف مسالہ فراہم کرتی رہتی ہیں۔ (اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ) ایسے افراد یا جماعتوں کے استیصال کے لئے حکومت سخت سے سخت اقدام پر حق بجانب ہوگی۔ (چنانچہ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ دیکھیں کہ) ایسی جماعتیں ملک میں پنپنے نہ پائیں۔ (ٹائمز آف کراچی ۲۷ فروری)

اس کے دو ہی دن بعد محترم وزیر اعظم نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

> ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو یاس و نا امیدی اور ہراسانی کے احساس کو عام کر رہے ہیں اور اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام اور سالمیت کو تباہ کر دیا جائے۔ ان کی ایسی کارروائیوں کا جواب یہ ہے کہ مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ (ڈان ۳۰ فروری)

آپ نے دیکھا کہ واضح طور پر نہ گورنر جنرل صاحب نے بتایا ہے اور نہ ہی وزیر اعظم صاحب نے کہ وہ کونسی جماعتیں اور عناصر ہیں جو ملک کی سالمیت و استحکام کے درپئے تخریب ہیں۔ اس سے لوگ پھر اسی کشمکش میں مبتلا ہو گئے کہ ہم کس جماعت کا ساتھ دیں اور کس سے کنارہ کشی اختیار کریں تاکہ وہ پنپ نہ سکے؟ اس کے برعکس قرائن و شواہد سے جن جماعتوں کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا تھا، ان کی طرف سے حکومت کو چیلنج تک دیدیا گیا کہ اگر ہمارے خلاف تمہارے پاس کوئی ثبوت موجود ہے تو ہم پر مقدمہ چلاؤ۔ آپ سوچئے کہ ذمہ دار حضرات کی طرف سے اس قسم اور اس انداز کی باتوں سے ملک کو فائدہ کی بجائے کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے؟

المرقوم ۲۷ فروری ۱۹۵۶ء

ہفتہ وار طلوع اسلام کے پرانے پرچے

محدود تعداد میں موجود ہیں جو رعایتی قیمت میں حاصل کئے جا سکتے ہیں ۱۹ مارچ ۱۹۵۳ء کا شمارہ ختم ہو چکا ہے۔ پرچہ کی اصل قیمت چار آنے فی پرچہ تھی۔ اور اگست ۱۹۵۳ء تا جنوری ۱۹۵۶ء چھ آنے فی پرچہ۔ رعایتی قیمت دو آنے فی پرچہ ہوگی۔ محصول ڈاک فی پرچہ ایک آنہ بذمہ خریدار ہوگا۔ پرچے بذریعہ وی پی یا قیمت کا منی آرڈر وصول ہونے پر روانہ کئے جائیں گے۔ ڈاک کے ٹکٹ بھی قیمت میں وصول کئے جا سکتے ہیں۔ پچاس اور زیادہ پرچوں کے خریداروں سے صرف رعایتی قیمت وصول کی جائے گی۔ بزم ہائے طلوع اسلام کو پرچے صرف چار آنے فی پرچہ قیمت پر دیئے جائیں گے۔

پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام، پوسٹ بکس ۴۳۱۲ کراچی

عائلی قوانین کے کمیشن کا
سوالنامہ
اور اس کا
جواب

(حکومت مرکزیہ پاکستان نے جو عائلی کمیشن مقرر کیا ہے اس کی طرف سے ایک سوالنامہ مختلف ارباب بصیرت کے پاس بھیجا گیا تھا۔ محترم پرویز صاحب نے اس سوالنامہ کا جو جواب بھیجا ہے۔ اسے درج ذیل کیا جاتا ہے تاکہ قارئین اس سے مستفید ہو سکیں۔

طلوع اسلام

(۱) سوال۔ کیا نکاح خواں کا کام صرف حکومت کے مقرر کردہ نکاح خوانوں کے ذریعے ہونا چاہیے۔

جواب۔ نکاح کے لئے اول تو کسی نکاح خواں کی ضرورت ہی نہیں۔ مرد اور عورت کے ایجاب و قبول سے معاہدہ نکاح کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر موجودہ شعار کو برقرار رکھنے کی ضرورت بھی جائے تو بھی اس کے لئے سرکاری نکاح خوانوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس رسم کو کوئی پورا کر سکتا ہے۔ اسے پھر سمجھ لینا چاہیے کہ نکاح خواں کی ضرورت قانونی نہیں محض رسمی ہے۔

(۲) سوال۔ کیا نکاحوں کا رجسٹری کرانا لازمی ہونا چاہیے اگر ایسا ہو تو اس کے لئے کیا طریق کار ہونا چاہیے۔ اور اس کی خلاف ورزی کے لئے کیا اور کیسے سزا ہونی چاہیے

جواب۔ چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اس کی رجسٹری ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والی بہت سی پیچیدگیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ بہتر ہو کہ نکاح نامہ کا ایک خاکہ (SKELETON FORM) حکومت کی طرف سے مرتب کر کے چھاپ دیا جائے (اس فارم کی زبان عام فہم ہونی چاہیے نہ کہ وہ "جناتی زبان" جس میں آج کل "قبالہ نکاح" کے فارم چھپتے ہیں) اس کے لئے ہر بستی یا بڑے شہر کے مختلف حلقوں میں رجسٹرار ہونے چاہئیں۔ جو خود نکاح کی مجلس میں شریک ہوں اور مرد اور عورت سے

براہ راست متصواب کے بعد نکاح نامہ رجسٹر کریں۔ اس رجسٹریشن کی شرط کو پورا کرانے کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرانا چاہیئے۔ اور اس کی سزا جرمانہ ہونی چاہیئے۔

(۳) سوال۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ زوجین میں سے ہر ایک نے کسی دباؤ کے بغیر اپنی رضامندی سے ایجاب و قبول کیا ہے۔ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

جواب۔ چونکہ معاہدۂ نکاح کے لئے فریقین کا عاقل اور بالغ ہونا لازمی شرط ہوگی۔ اس لئے اس کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ یہ معاہدہ برضا و رغبت ہوا ہے یا بجبر و اکراہ۔ مرد اور عورت دونوں رجسٹرار کے سامنے اس کا اقرار کریں گے اور یہی اس امر کا ثبوت ہوگا کہ یہ اقرار نامہ بطیب خاطر ہوا ہے۔ اگر اندرونی طور پر کسی قسم کا دباؤ بھی ہوگا تو طلاق کے متعلق مجوزہ قانون (جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے) اس معاہدہ کی تنسیخ کی صورت بآسانی پیدا کر دے گا۔

(۴) سوال۔ کیا آپ کے نزدیک کسی کی شادیوں کو روکنے کے لئے یہ قانون بنانا ضروری ہے کہ شادی کے وقت مرد کی عمر ۱۸ سال سے کم اور عورت کی عمر ۱۵ سال سے کم نہ ہو۔

جواب۔ قرآن کی رو سے معاہدۂ نکاح کے وقت فریقین کا بالغ اور عاقل (صاحب رشد) ہونا ضروری ہے۔ بلوغت کے لئے قرآن نے عمر کا تعین خود نہیں کیا۔ کیونکہ یہ عمر مختلف ممالک کی آب و ہوا اور دیگر اسباب کے مطابق مختلف ہوگی۔ ہمارے ملک میں بلوغت کی عمر کا تعین ڈاکٹروں کے مشورہ کے بعد کرنا چاہیئے اور یہی عمر قانون کی رُو سے بالغ ہونے کی شرط قرار دینی چاہیئے۔ نکاح نامہ کے فارم میں ایک خانہ عمر کا بھی ہونا چاہیئے۔ بلوغت کی عمر سے کم عمر کا نکاح قانوناً جائز نہیں سمجھنا چاہیئے اور اس کی سزا بڑی سخت ہونی چاہیئے۔

(۵) سوال۔ کیا آپ کے نزدیک نکاح کے لئے عمروں کا یہ تعین از روئے قرآن یا از روئے حدیث صحیح ممنوع ہے؟

جواب۔ اس باب میں قرآن کی رُو سے جو پوزیشن ہے وہ سوال (۴) کے جواب میں لکھی جا چکی ہے اور چونکہ حدیث بھی وہی صحیح سمجھی جا سکتی ہے۔ جو قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اس لئے صحیح حدیث کی رُو سے بھی وہی پوزیشن ہونی چاہیئے

(۶) سوال۔ کیا آپ اس سے بھی متفق ہیں کہ معاہدۂ ازدواج میں ہر ایسی شرط درج ہو سکتی ہے جو اسلام اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہ ہو اور عدالت اس کے ایفاء پر مجبور کرے۔

جواب۔ چونکہ معاہدۂ نکاح ایک عہد نامہ (AGREEMENT) ہے اس لئے اس میں ہر وہ شرط درج ہو سکتی ہے جو فریقین باہمی رضامندی سے طے کریں۔ اب رہا یہ کہ وہ شرط "اسلام اور قانون کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہ ہو" تو یہ شق بڑی مبہم ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعین بڑا مشکل ہو جائے گا کہ "اسلام اور اخلاق کے بنیادی اصول کیا ہیں (فسادات پنجاب کے سلسلہ میں جسٹس منیر کی عدالت کی کارروائی شاہد ہے کہ ہمارے ہاں یہ بھی متعین نہیں ہو سکتا کہ "مسلمان" کسے کہتے ہیں)، چونکہ ایک اسلامی مملکت میں تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ اس مملکت کا کوئی قانون اسلام اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہیں۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ معاہدۂ نکاح میں کوئی ایسی شرط درج نہیں ہونی چاہیئے جو ملک کے قوانین کے خلاف ہو۔ اگر کوئی ایسی شرط درج ہوگی تو قانون کے عام اصول کے مطابق وہ شرط عدالت کے نزدیک قابل قبول ہی نہیں ہوگی۔

باقی رہا عدالت کا ان شرطوں کے ایفاء پر مجبور کرنا تو قانونی مسابدہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ نقض عہد کی صورت میں مدعی فریق ثانی کو شرط متعلقہ کے ایفاء پر بذریعہ عدالت مجبور کر سکتا ہے۔

(۷) **سوال۔** کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ از روئے قانون یہ صحیح تسلیم کیا جائے کہ معاہدۂ ازدواج میں یہ شرط درج ہو سکتی ہے کہ عورت کو بھی اعلان طلاق کا وہی حق حاصل ہوگا جو مرد کو حاصل ہے۔

جواب۔ اس سوال کا جواب طلاق سے متعلق حصہ میں (آگے چل کر) ملے گا۔

(۸) **سوال۔** ہمارے معاشرہ کے بعض طبقوں میں دخترفروشی کا مکروہ رواج پایا جاتا ہے۔ اس کے انسداد کے لئے آپ کے نزدیک کس قسم کا اقدام مناسب ہوگا تاکہ والدین یا ولی لڑکی کو نکاح میں دیتے وقت رقمیں وصول نہ کر سکیں۔

جواب۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس رسم کی وجہ سے ہمارے ہاں لڑکیوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے اور اس کے انسداد کے لئے ضروری ہے کہ اسے جرم قرار دیا جائے اور اس جرم کا مرتکب سخت سزا کا مستوجب ہو۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس قسم کی اصلاحات قانون سے کہیں زیادہ صحیح تعلیم کے ذریعے ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً اگر ملک میں یہ قانون موجود ہو کہ

(۱) لڑکی کی شادی بالغ ہونے سے پہلے نہیں ہو سکتی۔

(۲) اس کی شادی اس کی اپنی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

(۳) وہ اپنے مہر کی آپ مالک ہے۔

(۴) اسے طلاق حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی سہولت میسر ہے۔

تو اس کے بعد "دخترفروشی" کے رسم کے انسداد کے لئے کرنا صرف یہ ہوگا کہ لڑکیوں کو بتایا جائے کہ قانون کے رُو سے ان کے حقوق کیا ہیں اور اگر کوئی شخص ان حقوق کو دبائے تو اس کا کیا علاج ہے؟ اس تعلیم کے عام ہو جانے سے لڑکیاں خود اپنے حقوق کی حفاظت کر سکنے کے قابل ہو سکیں گی۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عدالتوں کا موجودہ نظم و طریق بدل کر انہیں ایسا بنایا جائے کہ مظلوم اور حق داران کا دروازہ کھٹکھٹانے سے گھبرائے اور ٹھٹھکے نہیں۔ بالخصوص وہ عدالتیں جن میں عورتوں کے مقدمات پیش ہوتے ہوں۔ انہیں یقیناً ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر مظلوم انہیں اپنے لئے آغوش رحمت سمجھے۔

(۹) **سوال۔** کیا آپکے نزدیک یہ مناسب ہوگا کہ ایک معیاری نکاح نامہ مرتب کیا جائے اور نکاح کے تمام اندراجات اسکے مطابق ہوں

جواب۔ یہ ضروری ہے۔ (اس ضمن میں سوال (۲) کا جواب بھی ملاحظہ فرمایا جائے)۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عائلی قوانین کا خلاصہ نہایت سادہ زبان میں (اس فارم کے ساتھ یا الگ) چھاپ دیا جائے اور اس میں یہ بھی بتا دیا جائے کہ اگر کسی معاملہ میں عدالت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو تو اس کی آسان ترین شکل کیا ہے۔

طلاق

(۱) **سوال۔** اگر کوئی شوہر بیک وقت تین طلاقیں دے تو کیا آپ کے نزدیک اسے قطعی طلاق مغلظہ شمار کیا جائے یا تین

طہروں میں تین طلاقوں کے اعلان کے بغیر جیسا کہ قرآن میں ہدایت کی گئی ہے یہ مغلظہ شمار نہ ہو۔

جواب۔ طلاق کے متعلق رواج تو ایک طرف ہمارے موجودہ قوانین بھی (خواہ وہ شرعی ہوں یا ملکی) قرآن کی رو سے غلط ہیں۔ اور یہ غلطی اتنے عرصہ سے چلی آ رہی ہے کہ ہمیں اس کا احساس تک نہیں رہا۔ (چنانچہ خود مندرجہ بالا سوال میں جو بات قرآن کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ بھی قرآن کے مطابق نہیں)۔ لہٰذا اس کے متعلق قرآنی پوزیشن کا اچھی طرح سے سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) سب سے پہلے تو یہ کہ طلاق انفرادی فیصلہ ہے ہی نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ جب بھی چاہے عورت کو طلاق دیدے (خواہ ایک نشست میں ہو یا تین طہروں میں) اور عورت کو خلع حاصل کرنے کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ طلاق کا فیصلہ صرف عدالت کی طرف سے ہو سکتا ہے اور اس کے لئے جس طرح مرد عدالت کی طرف رجوع کر سکتا ہے اسی طرح عورت بھی کر سکتی ہے۔ اس باب میں دونوں کے حقوق برابر ہیں۔

(۲) میاں بیوی کے باہمی اختلاف کی صورت میں پہلا مرحلہ دونوں کے باہمی افہام و تفہیم کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے قانونی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اس کے بعد معاملہ مصالحتی مجلس کی طرف جاتا ہے۔ اس مجلس میں ایک نمائندہ عورت کا اور ایک مرد کا ضروری ہے۔ چونکہ اس مجلس کی رپورٹ کی حیثیت قانونی ہو گی۔ اس لئے اس کا تقرر بھی قانوناً ہی ہونا چاہیئے۔ اس مجلس کا اولین مقصد میاں بیوی میں موافقت کی شکل پیدا کرنا ہو گا۔ اگر یہ مجلس اپنے اس مقصد میں ناکام رہ جائے تو پھر معاملہ عدالت تک پہنچے گا۔ عدالت یہ دیکھے گی کہ زیادتی کس کی طرف سے ہے۔ یہ اس لئے دیکھنا ہو گا کہ فریق مقابل کے خلاف ہرجانہ کا تعین اس پر موقوف ہو گا۔

(۳) جب عدالت اس طرح انفساخ معاہدۂ نکاح کا فیصلہ کر دے تو اسے "طلاق" کہا جائے گا۔ اس سے میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی بتائی ہوئی شکل میں نہ تو مرد کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جب جی چاہے عورت کو طلاق دیدے اور نہ ہی ایک بار یا تین بار طلاق کا لفظ دہرانے یا ایک مجلس یا تین مجالس میں طلاق کہنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ طلاق کے معنی ہیں معاہدۂ نکاح سے رستگاری۔ لہٰذا اسے طلاق کہا ہی اس وقت جائے گا جب یہ معاہدہ ختم کر دیا جائے۔ بنابریں اس کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ طلاق کا لفظ کہہ دینے سے طلاق رجعی ہوتی ہے اور تین بار کہہ دینے سے وہ بائن ہو جاتی ہے۔ جب طلاق کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو بس وہ طلاق ہو جاتی ہے۔

(۴) جب کسی مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی میں مذکورہ بالا طریق کے مطابق پہلی بار طلاق واقع ہو جائے تو انہیں اس کا اختیار رہتا ہے کہ وہ دونوں باہمی رضامندی سے پھر تجدید نکاح کر کے دوبارہ ازدواجی زندگی شروع کر دیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن نے ایک مدت مقرر کر دی ہے جسے عدت کہتے ہیں۔ اس عدت کے دوران میں عورت کسی مرد کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔ اگر اس دوران میں سابقہ میاں بیوی باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح نہ کریں تو پھر عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے (اور چاہے تو اپنے سابقہ خاوند سے بھی ایسا کر سکتی ہے)

(۵) اگر اس مرد عورت نے مذکورہ بالا طریقہ سے دوبارہ ازدواجی زندگی شروع کر دی اور پھر (اسی طریق کے مطابق جس کی صراحت اوپر کی جا چکی ہے) دوبارہ طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔ تو یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہو گی۔ اس طلاق کے بعد بھی انہیں اس کا حق رہتا ہے کہ وہ

باہمی رضامندی سے نکاح کر کے پھر اپنی ازدواجی زندگی کی تجدید کر لیں۔ اس طرح انہوں نے دو طلاقیں ختم کر دیں۔ یعنی اپنی ازدواجی زندگی میں طلاق کے دو چانس (AVAIL OF) کر لئے۔

(۲) اب اگر پھر ان میں نوبت طلاق تک پہنچ گئی تو یہ تیسری طلاق ہوگی۔ اس طلاق کے بعد انہیں اس کا اختیار نہیں رہتا کہ یہ باہمی رضامندی سے تجدید نکاح کر لیں۔ اب یہ عورت کسی اور مرد ہی سے نکاح کر سکتی ہے۔ اب ان کی رجعت نہیں ہو سکتی۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے "طلاق رجعی" سے کیا مفہوم ہے اور "بائن" کب ہوتی ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ دو بار طلاق طلاق کہدینے سے (یا ایک ایک مہینے کے وقفہ سے طلاق کا لفظ دہرانے سے) طلاق رجعی ہوتی ہے اور جب تیسری بار طلاق کہدیا جائے (یا تیسرے مہینے پھر اس لفظ کو دہرایا جائے) تو طلاق بائن ہو جاتی ہے۔

(۱) جب شق (۲) کی رو سے وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر لے۔ اور اتفاق سے اس مرد سے بھی طلاق کی صورت پیدا ہو جائے (یا وہ فوت ہو جائے) تو یہ عورت اس صورت میں پھر اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔

یہ ہے قرآن کی رو سے طلاق اور تجدید نکاح کی پوزیشن۔ اس سے ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) طلاق کے متعلق ہمارا موجودہ قانون (خواہ شرعی ہو خواہ ملکی) قرآن کی رو سے صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اگر قانون طلاق کو اسلامی بنانا مقصود ہے تو اسے قرآن کے مطابق وضع کرنا چاہئے۔

(۲) سوال۔　کیا طلاق کا رجسٹری کرانا لازمی قرار دیا جائے۔

جواب۔　جب قرآنی طلاق کا نفاذ ہی عدالت کی طرف سے ہوگا تو وہ خود بخود "رجسٹری" ہو جائے گی۔

(۳) سوال۔　اگر طلاق کی رجسٹری نہ ہو تو آپ کے نزدیک اس کی کیا سزا ہونی چاہئے۔

جواب۔　مندرجہ بالا جواب کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

(۴) سوال۔　کیا مختلف علاقوں کے لئے مصالحتی مجالس مقرر کی جائیں۔ اور کسی طلاق کو اس وقت تک صحیح تسلیم نہ کیا جائے جب تک کہ فریقین ان مجالس کی طرف رجوع نہ کر چکے ہوں جن میں زوجین کے خاندانوں کی طرف سے بھی ایک ایک حکم شامل ہو۔

جواب۔　جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کی رو سے طلاق سے پہلے معاملہ کا حکموں کے سامنے جانا ضروری ہے۔ لہٰذا اس قسم کی مصالحتی مجالس کا تقرر ضروری ہوگا۔

(۵) سوال۔　کیا "ازدواجی و عائلی عدالت" کو مطلقہ کے مطالبہ پر یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ مطلقہ کو تا حین حیات یا تا عقد ثانی نفقہ دلوائے۔

جواب۔　اگر عدالت اس نتیجہ پر پہنچے کہ جن وجوہات کی بنا پر طلاق نافذ ہوئی ہے ان میں مرد کی طرف سے سراسر زیادتی ہے تو ایسی صورت میں عدالت کو ضرور اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ عورت کو تا عقد ثانی مرد سے نفقہ دلائے۔ ایک عورت اپنی جوانی مرد کی رفاقت میں بسر کر دیتی ہے۔ اس کے بعد مرد ناحق زیادتی سے معاملہ طلاق تک لے آتا ہے۔ تو ایسی صورت میں عورت (معاشرہ کے موجودہ معاشی نظام کے پیش نظر) اپنی کفالت کے لئے کہاں جائے؟ اس کا انتظام نہایت ضروری ہے۔

عورت کی طرف سے مطالبہ طلاق

(۱) سوال۔ کیا آپ ڈسولیوشن آف میرج ایکٹ ۱۹۳۹ء (انفساخ نکاح مسلمین ۱۹۳۹ء) کی تمام دفعات کو جامع اور تشفی بخش سمجھتے ہیں یا آپ کے نزدیک اس میں اضافہ و ترمیم ہونی چاہیئے۔

جواب۔ اس ایکٹ کی کاپی میرے پاس نہیں۔ نہ ہی یہ سوال نامہ کے ساتھ موصول ہوئی ہے۔ اس لئے اس سوال کے جواب سے معذور ہوں۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ طلاق کے مطالبہ کے لئے مرد اور عورت کے حقوق یکساں ہیں۔ اس لئے عورتوں کے لئے کسی الگ قانون کی ضرورت نہیں۔

(۲) سوال۔ کیا آپ کے نزدیک یہ مناسب ہوگا کہ خلع کے متعلق مجلس آئین ساز واضح اور غیر مبہم قانون وضع کرے۔

جواب۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ (صرف خلع ہی نہیں بلکہ) پوری عائلی زندگی کے متعلق قرآن کی روشنی میں نہایت واضح اور غیر مبہم قوانین وضع کئے جائیں اور ان کی عام اشاعت کی جائے۔

تعدد ازدواج

(۱) سوال۔ قرآن کریم میں تعدد ازدواج کی بابت ایک ہی آیت (۴/۴) ہے جو حقوق یتامیٰ کی حفاظت کے ساتھ وابستہ ہے کیا آپ کے نزدیک جہاں حقوق یتامیٰ کا سوال نہ ہو وہاں تعدد ازدواج کو ممنوع کیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ جب قرآن کریم نے ایک اجازت کو کسی خاص شرط کے ساتھ مشروط کر دیا۔ تو اس شرط کی عدم موجودگی میں وہ اجازت باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا جہاں یتامیٰ کی حفاظت کا سوال درپیش نہ ہو وہاں قرآن کی رو سے تعدد ازدواج کی اجازت ہی نہیں۔ اس لئے اس کا ممنوع قرار دینا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ حفاظت یتامیٰ کا سوال اجتماعی ہوگا۔ یعنی ملک میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بے شوہر عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلہ کا اور کوئی حل ہی نہ رہے تو اس وقت مملکت کو اس کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو چکے ہیں جن میں تعدد ازدواج کی صورت ناگزیر ہو گئی ہے۔

(۲) سوال۔ کیا آپ کے نزدیک یہ لازمی ہونا چاہیئے کہ عقد ثانی کا ارادہ رکھنے والا شخص عدالت سے اجازت حاصل کرے۔

جواب۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے پہلے تو اجتماعی طور پر مملکت کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو چکے ہیں جن میں تعدد ازدواج کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ پھر اس کے بعد انفرادی طور پر عدالت فیصلہ کرے گی کہ یہ اجازت کس کس کو دی جا سکتی ہے۔

(۳) سوال۔ کیا آپ کے نزدیک یہ قانون ہونا چاہیئے کہ عدالت یہ اجازت اس وقت تک نہیں دے سکتی جب تک اسے اطمینان نہ ہو کہ درخواست دہندہ دونوں بیویوں اور ان کی اولاد کی اس معیار زندگی کے مطابق کفالت کر سکتا ہے جس کے وہ عادی ہیں۔

جواب۔ یقیناً یہ اجازت اسی صورت میں دینی چاہیئے۔ لیکن جب یہ مسئلہ مملکت کے ایک اجتماعی مسئلہ کے حل کے لئے اختیار

کی جائے گی تو یہ مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ دیکھے کہ اگر اس مرد کی آمدنی اس دوسرے خاندان کی کفالت کے لئے کافی نہیں تو اس کمی کو مملکت کی طرف سے پورا کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے تمام افراد مملکت کی پرورش کی ذمہ داری خود مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ ان افراد کی مختلف خاندانوں میں تقسیم انسان کی عمرانی زندگی کی مصلحتوں اور تقاضوں کی بنا پر ہے نہ کہ اس بنا پر کہ ایک مرد تمام افراد خاندان کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔ مرد کا فریضہ اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق کام کرنا ہے۔ افراد خاندان کی پرورش کی ذمہ داری مملکت کی ہے۔ بہرحال جب تک اس قسم کا قرآنی نظام قائم نہیں ہوتا۔ عدالت کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ ان دونوں خاندانوں کی کفالت کا خاطر خواہ انتظام موجود ہے۔

(۴) سوال۔ کیا یہ قانون ہونا چاہیئے کہ دوسری شادی کرنے والے کی کم از کم نصف تنخواہ پہلی بیوی اور اس کی اولاد کو عدالت دلوائے۔

جواب۔ سابقہ شق کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ سوال خارج از بحث ہے۔ ویسے بھی نصف تنخواہ یا نصف آمدنی کا اصول ہر جگہ مناسب اور انصاف کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا ہوگا کہ دونوں خاندانوں کی کفالت کا خاطر خواہ انتظام کس طرح ہو سکتا ہے۔

(۵) سوال۔ اور جو لوگ تنخواہ دار نہیں بلکہ دوسرے ذرائع آمدنی رکھتے ہیں ان سے عدالت ضمانت لے کہ وہ اپنی آمدنی کا کم از کم نصف پہلی بیوی اور اس کی اولاد کو دیتے رہیں گے۔

جواب۔ سوال (۴) کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔

مہر

(۱) سوال۔ کیا آپ کے نزدیک یہ قانون بن جانا چاہیئے کہ معاہدۂ ازدواج میں جو مہر مقرر کیا گیا ہے خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کثیر کیوں نہ ہو وہ شوہر کے لئے واجب الادا ہے۔

جواب۔ ہر ایک واجب الادا رقم ہے اس لئے اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں کمی کر دے یا بالکل معاف کر دے۔ اس کی بہترین شکل تو یہ ہے کہ مہر نکاح کے وقت ادا کر دیا جائے لیکن اگر عورت چاہے تو اسے بطور واجب الوصول قرض کے نکاح نامہ میں درج کرا سکتی ہے۔ اس صورت میں عورت جب چاہے اسے وصول کر سکتی ہے اور مرد کی طرف سے عدم ادائیگی کی صورت میں اسے عدالت دلوا سکتی ہے۔

(۲) سوال۔ کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ مطالبۂ مہر کے لئے از روئے قانون کسی مدت کی تحدید نہ ہو؟

جواب۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس بات کا تعین عورت کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جس طرح چاہے اس کا فیصلہ کرلے۔ قانون کی رو سے کسی مدت کی تحدید کی ضرورت نہیں۔

(۳) سوال۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر اقرار نامہ میں ادائے مہر کی صورت کا کوئی تعین نہ ہو تو نصف مہر

معجل (عند الطلب) اور نصف دیگر مؤجل (بعد انفساخ نکاح یا وفات شوہر یا بصورت طلاق) شمار ہو۔

جواب۔ اوّل تو رجسٹرار کو دیکھ لینا چاہیئے کہ نکاح نامہ میں اس کی تصریح موجود ہے لیکن اگر کسی شاذ صورت میں یہ تصریح نہ ہو تو پھر پورے مہر کی ادائیگی عند الطلب قرار دی جائے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ مہر مرد کے ذمہ واجب الادا قرض کا نام ہے جسے (کسی دوسری شرط کی عدم موجودگی میں) عند الطلب ادا کرنا ہوگا۔

حضانت

سوال۔ موجودہ قانون کی رو سے بچوں کی حضانت کا حق ماں کو خاص عمر تک حاصل ہے۔ یعنی لڑکا ہو تو سات سال۔ لڑکی ہو تو بلوغ تک۔ حضانت کے لئے عمروں کا یہ تعین نہ تو قرآن میں ہے اور نہ کسی حدیث میں بلکہ یہ بعض فقہا کا اجتہاد ہے کیا آپ کے نزدیک اس میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے۔

جواب۔ حضانت سے مقصود یہ ہے کہ بچوں کی صحیح پرورش تعلیم و تربیت کا انتظام کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی کلیہ قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر مقدمہ میں انفرادی حالات کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا لہٰذا اسے عدالت کے صوابدید پر چھوڑنا چاہیئے کہ وہ جو انتظام مناسب خیال کرے اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ البتہ اس انتظام میں علاوہ دیگر امور ماں اور باپ دونوں کے جذبات کا لحاظ بھی ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ اولاد کا معاملہ محض انتظامی نہیں۔ جذباتی بھی ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات منقطع ہو جانے سے اولاد کے ساتھ ان کے تعلقات بھی منقطع نہیں ہو جاتے۔ لہٰذا ان تعلقات کی پاسداری ضروری ہے۔

بیوی بچّوں کا گذارہ

(۱) سوال۔ کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ کوئی شوہر کسی معقول وجہ کے بغیر بیوی کو گذارہ نہ دے تو بیوی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ خاص "ازدواجی و عائلی عدالت" میں اس پر دعوےٰ کر سکے۔

جواب۔ بیوی کو یہ حق ضرور ہونا چاہیئے بلکہ بچّوں کو بھی۔

(۲) سوال۔ موجودہ کریمنل پروسیجر کوڈ (ضابطۂ فوجداری) کے دفعہ ۴۸۸ کے مطابق بیوی عدالت فوجداری میں نفقہ کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ لیکن عدالت فوجداری زیادہ سے زیادہ سو روپے ماہانہ دلوا سکتی ہے۔ کیا آپ اس مقدار کے اضافہ کے حق میں ہیں؟

جواب۔ کسی خاص مقدار کا تعین از روئے قانون مناسب نہیں۔ عدالت کو اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ ہر انفرادی مقدمہ میں حالات کے مطابق فیصلہ کرے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی درخواست موصول ہونے پر عدالت ابتدائی سرسری تحقیقات کے بعد عارضی گذارہ (PROVISIONAL MAINTENANCE ALLOWANCE) کے احکام تا انفصال مقدمہ فوراً جاری کر دے۔

(۳) سوال۔　کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایک بیوی گذشتہ تین سال تک کے نفقہ کا مطالبہ کر سکے۔

جواب۔　تین سال کی شرط ضروری نہیں۔ جس مدت کے لئے بھی یہ ثابت ہو جائے کہ مرد نے گذارہ نہیں دیا اس مدت تک کا گذارہ عدالت کو دلوانا چاہیئے۔

(۴) سوال۔　کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر بیوی نے نکاح نامہ میں میعاد نفقہ کے متعلق خاص شرط منوالی ہو تو اسے محض مدت عدت تک ہی نہیں بلکہ مدت مشروط تک نفقہ ملے۔

جواب۔　ہراقرارنامہ کی شرائط کی طرح نکاح نامہ کی شرائط کو قانونی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ لیکن اس باب میں عدالت کے لئے مخصوص حالات کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہوگا۔ مثلاً اگر نکاح نامہ میں مدت العمر کے لئے گذارہ کی شرط لکھی ہے اور عدالت یہ دیکھتی ہے کہ طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہے اور مرد نے ایسے حالات پیدا نہیں کئے جن کی رو سے عورت اس مطالبہ پر مجبور ہو رہی ہے تو عدالت نکاح نامہ کی اس شرط کو کہ گذارہ مدت العمر کے لئے دینا ہوگا، منسوخ کر سکتی ہے یا اس میں مناسب ترمیم کر سکتی ہے۔ اس مثال پر دیگر انفرادی حالات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

تولیت املاک

(۱) سوال۔　کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ باپ کی عدم موجودگی میں عدالت ماں کو بچوں کی املاک کی متولیہ قرار دے کے نزدیک اس کا تقرر بچوں کی بہبود اور املاک کے تحفظ کے منافی نہ ہو۔

جواب۔　جی ہاں۔

(۲) سوال۔　کیا آپ یہ قانون بنانے کے حق میں ہیں کہ نابالغوں کی املاک کے متولی کو یہ اختیار حاصل نہ ہو کہ وہ عدالت کی اجازت کے بغیر املاک کو فروخت یا رہن کر سکے۔

جواب:　جب تک کہ قرآن کا معاشی نظام قائم نہ ہو اس قسم کا قانون نہایت ضروری ہے۔

وراثت اور وصیت

(۱) سوال۔　کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ اگر پاکستان کے کسی حصہ میں ابھی تک وراثت اور وصیت کے بارے میں شرعی قوانین پر عمل نہیں ہو رہا تو بلا تاخیر ایسا قانون وضع کیا جائے کہ اس بارے میں شرعی قوانین ہر حصۂ ملک پر نافذ ہوں۔

(۲) جواب۔　اس باب میں تو دو آراء ہو ہی نہیں سکتیں کہ ایک اسلامی مملکت میں ہر مسلمان پر قوانین شریعت نافذ ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ (طلاق کی طرح) وراثت و وصیت کے متعلق ہمارے شرعی قوانین بھی قرآن کے خلاف ہیں اس لئے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ ان قوانین کو قرآن کے مطابق بنایا جائے۔ مثلاً قرآن ہر شخص کو اس کا حق دیتا ہے کہ وہ اپنے مال اور املاک کے متعلق

اپنے انفرادی حالات کے پیشِ نظر جو وصیت مناسب سمجھے کرے۔ لیکن ہمارا شرعی قانون ۱/۳ حصہ سے زائد میں وصیت کا حق نہیں دیتا۔ اور یہ وصیت بھی ورثاء کے متعلق نہیں ہو سکتی۔ نیز قرآن نے تقسیمِ وراثت کے لئے جو قاعدے مقرر کئے ہیں ہمارا موجودہ شرعی قانون ان کے مطابق نہیں۔ واضح رہے کہ ترکہ اور وراثت کے احکام اس وقت تک نافذ العمل ہوں گے جب تک قرآن کا معاشی نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوتا۔ چونکہ ہم اس وقت اپنے موجودہ معاشی نظام کو سامنے رکھ کر بات کر رہے ہیں اس لئے قوانینِ وصیت و وراثت کا ذکر گزرا ہے۔

(۲) سوال۔ موجودہ قانونی مسلک کی پیچیدگی کے پیشِ نظر عورتوں کی مجبوریوں کو رفع کرنے کے لئے کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ جب کبھی وراثت کے معاملے میں عورت مدعیہ ہو تو دیوانی کورٹ اس کا مقدمہ عجلت انفصال کے لئے ازدواجی و عائلی عدالت میں منتقل کر دے۔

جواب۔ طریقِ کار کوئی بھی اختیار کیا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ اس قسم کے مقدمات کا فیصلہ جلد از جلد اور بغیر پریشانی کے ہو جایا کرے۔

(۳) سوال۔ کیا قرآن کریم میں نص صریح موجود ہے یا کسی صحیح حدیث میں یہ تعلیم ملتی ہے کہ یتیم پوتے یا پوتی یا نواسے یا نواسی کو محروم الارث کر دیا جائے۔

جواب۔ معاذ اللہ۔ قرآن میں اس قسم کا حکم کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک تو بچہ اپنے باپ کے سایہ سے محروم ہو جائے اور پھر اسے ورثہ سے بھی محروم کر دیا جائے۔ قرآن یتیموں کے حقوق کے تحفظ کے لئے آیا ہے۔ انہیں ان کے جائز حقوق سے محروم کرنے کے لئے نہیں آیا۔ لہٰذا اس قسم کی نص صریح تو ایک طرف کوئی اشارہ تک بھی ایسا نہیں جس سے یہ مستنبط ہو سکے کہ یتیم پوتا پوتی وغیرہ محروم الارث ہوں گے۔ اس کے برعکس قرآن کی صریح تعلیم کے مطابق ایسے یتیموں کو ان کی وراثت کا حصہ ضرور ملنا چاہیئے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ "یتیم پوتے کی وراثت" ملاحظہ فرمایا جائے۔ اس کی ایک کاپی منسلک ہے۔

(۴) سوال۔ کیا ایسا قانون بنانا جائز ہوگا کہ ایک مسلمان کسی جائیداد کو کسی کے نام اس شرط پر منتقل کر دے کہ جسے منتقل کی گئی ہے اس کی وفات کے بعد وہ جائیداد منتقل کرنے والے یا اس کے ورثاء کی طرف عود کر آئے گی۔

جواب۔ قرآن کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق انتفاع نہیں بلکہ حق ملکیت ہی دوسروں کی طرف منتقل کیا جائے لہٰذا اس قسم کا قانون قرآنی منشاء کے خلاف ہوگا۔

(۵) سوال۔ کیا آپ کی رائے میں وقف علی الاولاد ایکٹ ۱۹۱۳ء میں بغرض اصلاح اس ترمیم کی ضرورت ہے کہ وقف شدہ جائیداد کے اضافہ قیمت یا دیگر مفاد کی خاطر باجازت عدالت اسے فروخت یا تبدیل کیا جائے یا کسی اور مفید طریق پر عمل ہو سکے۔

جواب۔ وقف علی الاولاد کا ایکٹ ۱۹۱۳ء ہمارے سامنے نہیں۔ لیکن قرآن کی رو سے وقف علی الاولاد کو ایک طرف کسی قسم کے وقف کی بھی دینی حیثیت کچھ نہیں۔ مرنے والوں کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ ابد الآباد تک زندوں پر اپنا حکم چلاتے رہیں۔ مرنے والا اپنی جائیداد کا حق ملکیت

اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جن لوگوں تک اس کا ترکہ قانوناً پہنچتا ہے وہ اس پر حق ملکیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رو سے ہر قسم کا وقف ایکٹ منسوخ ہو جانا چاہیئے۔

انفساخ نکاح بذریعہ عدالت

(۱) سوال۔ قانون انفساخ نکاح کے سیکشن (۲) میں جو وجوہ انفساخ درج ہیں کیا آپ کے نزدیک ان میں اضافہ یا کمی کی ضرورت ہے۔

جواب۔ محولہ صدر قانون میرے پاس موجود نہیں۔ اس لئے اس سوال کے جواب سے معذور ہوں۔ البتہ طلاق کے باب میں جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کی رو سے

(۱) انفساخ نکاح کو طلاق کہتے ہیں۔ اور

(۲) طلاق بذریعہ عدالت حاصل کی جا سکتی ہے۔

طلاق کے لئے وجوہات کا قانونی تعین مناسب نہیں۔ نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ نکاح کی بنیاد باہمی موافقت بلکہ مودت پر ہے۔ جب باہمی موافقت نہ رہے تو اس معاہدہ کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ عدالت کو یہ دیکھنا ہوگا کہ عدم موافقت کے حالات کس کی طرف سے پیدا کئے گئے ہیں تاکہ اس کے مطابق ہرجانہ کی ذمہ داری کا تعین کیا جا سکے۔

(۲) سوال۔ کیا ایسا قانون وضع ہونا چاہیئے کہ اگر عورت انفساخ نکاح کا مطالبہ کرے اور عدالت کی رائے میں قصوروار شوہر ہو تو طلاق حاصل کرتے ہوئے عورت سے نہ مہر واپس دلوایا جائے اور نہ دوسری چیزیں جو خاوند اسے دے چکا ہو۔

جواب۔ ضرور ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس قانون کی حیثیت عمومی ہونی چاہیئے کہ طلاق کے مقدمات میں عدالت اس کا فیصلہ کرے کہ قصوروار کون ہے (یعنی کس کی طرف سے ایسے حالات پیدا کئے گئے ہیں جن میں طلاق ناگزیر ہو گئی ہے) اور اس کے مطابق وہ ہرجانہ کا تعین کرے۔

(۳) سوال۔ کیا زوجین کا ایسا اختلاف مزاج جس کی وجہ سے ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہو جائے جائز طور پر وجہ فسخ نکاح ہو سکتا ہے۔

جواب۔ یہ تو فسخ نکاح کی بنیادی وجہ ہو سکتی ہے۔

(۴) سوال۔ قانون انفساخ نکاح کے کلاز (۳) سیکشن (۲) میں سات سال کی قید کی بنا پر نکاح فسخ ہو سکتا ہے کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس مدت میں کمی کر کے چار سال کر دیا جائے۔

جواب۔ اس باب میں کسی مدت کے تعین کی ضرورت نہیں۔ قوانین نکاح و طلاق کے ضمن میں اس اصل عظیم کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے کہ نکاح کی بنیاد باہمی نباہ ہے۔ جب تک یہ نباہ ہو سکتا ہے نکاح موجود ہے جب نباہ کی شکل باقی نہ رہے تو نکاح کی بنیاد ہی

باقی نہیں رہتی۔ نباہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے قانونی پابندیوں سے پیدا یا قائم رکھا جا سکے۔ یہ تو دلوں کی گہرائیوں سے اُبھرے گا۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (جیل خانہ تو کجا) خاوند کے گھر میں موجود رہنے سے بھی نباہ ممکن نہ رہے اور یہ بھی کہ (قید تو ایک طرف) خاوند کی موت کے بعد بھی عورت اپنی باقی عمر اس کی محبت میں یہ کہکر بسر کر دے کہ

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

قید کے ضمن میں البتہ دو ایک باتیں ایسی ہیں جن کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ اول تو یہ کہ قیدیوں کو کچھ وقفہ کے بعد اپنے بیوی بچوں کے پاس آنے اور کچھ وقت کے لئے رہنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ جب تک قرآنی نظام ربوبیت قائم نہیں ہوتا، قیدی کے بیوی بچوں کی کفالت مملکت کا فریضہ ہونا چاہیئے۔

ازدواجی و عائلی عدالت

(۱) سوال۔ کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ ہر کمشنری میں دو سرکٹ اور شش جج کے مرتبہ کا جج ایسی عدالتوں میں مقرر کیا جائے جہاں ازدواجی و عائلی مقدمات دائر ہوں۔

(۲) سوال۔ کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایسے مقدمات جو ازدواجی و عائلی قوانین کے تحت آئے ہوں اور جہاں عورت مدعیہ ہو فقط ایسی مخصوص عدالتوں میں دائر ہو سکیں۔

(۳) کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایسی عدالتوں کے ضوابط موجودہ دیوانی اور فوجداری ضوابط سے الگ ہوں اور یہ قانون وضع کر دیا جائے کہ ایسی عدالت ہر مقدمہ کا فیصلہ تین ماہ کے اندر اندر کر دے۔

(۱) تا (۳) جواب۔ یہ تجاویز مناسب ہیں۔

(۴) سوال۔ کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایسی عدالتوں میں کورٹ فیس یا دوسرے عدالتی اخراجات نہ ہوں۔

جواب۔ صرف ایسی عدالتوں میں نہیں بلکہ ایک اسلامی مملکت میں انصاف کا حصول ہر مقام پر بلا قیمت ہونا چاہیئے۔

(۵) سوال۔ کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایسی عدالتوں میں فریقین اپنے کسی نمائندہ یا اقارب کے ذریعہ پیروی کریں اور کسی باقاعدہ سند یافتہ وکیل کا ہونا لازمی نہ ہو۔

جواب۔ فریقین اگر چاہیں تو اپنے نمائندوں یا اقارب کے ذریعے پیروی کر سکتے ہیں۔ وکلا کی تو (Institution) ہی ختم کر دینی چاہیئے۔ اس سے قوم تباہ ہو رہی ہے اور انصاف کی مٹی پلید۔ فریقین کا کام واقعات بیان کرنا ہوگا۔ اور یہ دیکھنا عدالت کا فریضہ ہوگا کہ قانون کس کے حق میں جاتا ہے۔

(۶) سوال۔ کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ کم از کم ایک مرد اور ایک عورت بطور مشیر جج کے ساتھ ہوں۔

جواب۔ تجویز مناسب ہے۔

(۷) سوال۔ کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایسی عدالت مختلف اضلاع میں باری باری اپنا اجلاس کرے۔

جواب۔ اس کا تعلق عدالتی نظم و نسق سے ہے۔ اگر ایک ضلع کے مقدمات ہی اتنے ہوں کہ عدالت کا سارا وقت اپنی میں صرف ہو جائے تو وہ دوسرے ضلع میں کس طرح اجلاس منعقد کر سکتی ہیں۔

(۸) سوال۔ کیا آپ اس کے حق میں ہیں کہ فریقین کو ایک سے زیادہ اپیل کی اجازت نہ ہو۔

جواب۔ ابتدائی عدالت کی حیثیت اتنی بلند ہونی چاہیئے کہ اس کے فیصلہ کے بعد ایک سے زائد اپیل کی گنجائش ہی نہ رہے نیز اپیل کے فیصلے کے لئے بھی زیادہ سے زیادہ مدت کا تعین کر دینا چاہیئے۔

(۹) سوال۔ کیا آپ اس کے حق میں ہیں کہ اپیل براہ راست ہائی کورٹ میں ہونی چاہیئے اور اپیل کا فیصلہ بھی تین ماہ کے اندر ہو جانا چاہیئے۔

جواب۔ سوال (۸) کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔

(۱۰) سوال۔ ایسی عدالت کے فیصلے سے واجب الادا رقوم کی وصولی اور دیگر احکام کی بجاآوری کے لئے آپ کیا مناسب تجویز پیش کرتے ہیں۔

جواب۔ اس کے لئے طریق کار وہی ہونا چاہیئے جو حکومت کے مطالبات کے وصول کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے عدالت کے اختیارات وسیع ہونے چاہئیں۔

(۱۱) سوال۔ ایسے مقامات میں اخراجات متفرقہ کو پورا کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے انصاف کا حصول بلا قیمت ہونا چاہیئے۔ اس کے اخراجات حکومت کو برداشت کرنے چاہئیں۔ کیونکہ حکومت کے وجود کا جواز ہی عدل گستری ہے۔

میں نے ان سوالات کے جوابات اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق دیئے ہیں۔ چونکہ اس کا مطالبہ نہیں کیا گیا کہ جواب کے لئے سند بھی دی جائے اس لئے قرآنی آیات کو درج نہیں کیا گیا۔ اگر کسی جواب کے سلسلہ میں متعلقہ قرآنی آیت مطلوب ہو تو اس کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

والسلام

پرویز

مُلّا کے جوابات

مندرجہ صدر جوابات قرآن کریم کی روشنی میں دیئے گئے ہیں اور، جیسا کہ مجیب نے لکھا ہے، ان کی تائید میں قرآنی آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلاتے کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ان سوالات کے کیا جواب دیئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے دورِ استبداد میں وضع شدہ مذہب کی رُو سے (جس کے علمبردار ہمارے قدامت پرست حضرات ہیں) عورت کی حیثیت لونڈی کے برابر بھی نہیں رہ جاتی۔ دیگر مولوی صاحبان کی طرف سے اس سوالنامہ کے جو جوابات دیئے گئے ہیں، وہ تو ہمارے سامنے نہیں آئے۔ البتہ مودودی صاحب نے اپنے جوابات ترجمان القرآن میں شائع کر دیئے ہیں۔ ہم ان میں سے اہم سوالات کے جوابات ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اسے پیشِ نظر رکھئے کہ مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ قدامت پرست مُلّا نہیں ہیں۔ یعنی ذیل کے جوابات ایک جدت پسند مُلّا کے ہیں۔ اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے گا کہ جب یہ جواب جدت پسند مُلّا کے ہیں، تو قدامت پسند مُلّا صاحبان نے کیا کچھ لکھا ہوگا۔ بہرحال مودودی صاحب کے جواب ملاحظہ فرمایئے۔

کم سنی کی شادی سوال — کیا آپ کے نزدیک نکاح کے لئے عمروں کا یہ تعین ازروئے قرآن کریم یا ازروئے حدیثِ صحیح ممنوع ہے؟

جواب۔ نکاح کے لئے عمروں کے تعین کی کوئی صریح ممانعت تو قرآن و حدیث میں نہیں ہے، مگر کم سنی کے نکاح کا جواز سنت سے ثابت ہے اور احادیثِ صحیحہ میں اس کے عملی نظائر موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو چیز شرعاً جائز ہے اس کو آپ قانوناً حرام کس دلیل سے کرتے ہیں؟ آپ کا ایک عمر ازروئے قانون مقرر کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس عمر سے کم میں اگر کوئی نکاح کیا جائے تو آپ اسے باطل قرار دیں گے اور ملکی عدالتیں اس کو تسلیم نہ کریں گی۔ کیا اسے ناجائز اور باطل ٹھہرانے کے لئے کوئی اجازت قرآن یا حدیثِ صحیح میں موجود ہے؟ دراصل یہ طرزِ سوال بہت ہی مغالطہ آمیز ہے۔ تعیینِ عمر صرف ایک ایجابی پہلو ہی نہیں رکھتی بلکہ ساتھ ساتھ ایک سلبی پہلو بھی رکھتی ہے۔ اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آپ نکاح کے لئے محض ایک عمر مقرر کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس عمر سے پہلے نکاح کرنے کو آپ حرام بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس منفی پہلو کو نظر انداز کر کے صرف یہ پوچھنا کہ کیا اس کا مثبت پہلو ممنوع ہے سوال کو ادھوری شکل میں پیش کرنا ہے۔ سوال کی تکمیل اس وقت ہوگی جب آپ ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھیں کہ کیا ایک عمرِ خاص سے پہلے نکاح کو ناجائز ٹھہرانے کے حق میں کوئی دلیل قرآن یا کسی حدیثِ صحیح میں ملتی ہے؟

طلوعِ اسلام۔ قرآن نے نکاح کے لئے بلوغت کو شرط قرار دیا ہے بلکہ اس نے "بلوغت" کی تعریف (DEFINITION) ہی "نکاح کی عمر" کہہ کر کی ہے (دیکھئے ۴:۶)۔ لیکن مودودی صاحب کو اس کے باوجود، کم سنی کی شادی کے خلاف قرآن سے کوئی دلیل نہیں ملتی!

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

عورت کو طلاق کا حق سوال — کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ ازروئے قانون یہ صحیح تسلیم کیا جائے کہ معاہدۂ ازدواج میں یہ شرط

درج ہو سکتی ہے کہ عورت کو بھی اعلانِ طلاق کا وہی حق حاصل ہوگا جو مرد کو حاصل ہے؟

جواب۔ اگر ایجاب و قبول کے وقت عورت یہ کہے کہ میں اپنے آپ کو تیرے نکاح میں اس شرط کے ساتھ دیتی ہوں کہ میں جب چاہوں اپنے اوپر طلاق وارد کرنے کی مختار ہوں گی، اور مرد اسے قبول کرے تو قانوناً اس شرط کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورت تفویضِ طلاق کی ہے اور فقہا نے اسے جائز رکھا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تفویضِ طلاق کا قانوناً جائز ہونا اور چیز ہے اور اسلامی معاشرے میں اسے رواج دینے کی کوشش کرنا اور چیز۔ اس کا قانونی جواز تو صرف اس بنا پر ہے کہ مرد کو شریعت نے طلاق کا جو اختیار دیا ہے اسے وہ اپنی طرف سے نیابتاً یا وکالتاً جسے چاہے سونپ سکتا ہے اور عورت کو بھی وہ تفویض کر سکتا ہے لیکن عملی ترویج اور ہر معاہدۂ نکاح میں اس شرط کو شامل کرنے کی کوشش قطعاً اسلام کی منشا کے خلاف ہے۔ اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان حقوق و اختیارات کا جو تناسب قائم کیا ہے اس کا یہ نظری اور منطقی تقاضا ہے کہ زوجین میں سے صرف مرد ہی طلاق کا مختار ہو۔ اس نے مہر اور زمانۂ عدت کا نفقہ اور چھوٹے بچوں کے زمانۂ رضاعت و حضانت کا خرچ کلیتہً مرد پر ڈالا ہے۔ اس لئے مرد مجبور ہے کہ طلاق کا اختیار استعمال کرنے میں احتیاط سے کام لے، کیونکہ اس کا پورا مالی نقصان اسی کو برداشت کرنا ہوگا۔ بخلاف اس کے عورت پر کوئی مالی ذمہ داری اس نے عائد نہیں کی ہے بلکہ طلاق کے نتیجہ میں اسے کچھ لینا ہی ہوتا ہے، دینا کچھ نہیں ہوتا اس لئے وہ اختیارِ طلاق کے استعمال میں سخت بے احتیاطی کر سکتی ہے، بلکہ ذرا سے اشتعال پر بھی بے تکلف طلاق دے سکتی ہے۔ ان وجوہ سے عورت کی طرف اس اختیار کو منتقل کر دینا اس اسکیم کے بالکل خلاف ہے جو اسلام نے اپنے ازدواجی قانون میں پیشِ نظر رکھی ہے۔ اس غلط طریقے کو اگر رائج کیا گیا تو معاشرے میں اس کے بہت برے نتائج رونما ہوں گے اور ہر کثرتِ طلاق کی ایک ایسی وبا سے دوچار ہو جائیں گے جس سے اب تک ہمارا معاشرہ محفوظ رہا ہے۔

طلوع اسلام بجا اور درست، کم سن لڑکی کی شادی کا اختیار اس کے ولی کو ہے اور طلاق کا اختیار صرف مرد کو! یہ ہے وہ مذہب جسے یہ حضرات دنیا کے سامنے بے مثل و بے نظیر کہہ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ ایک قرآن کے چھوڑ دینے سے مسلمان کہاں جا پہنچا ہے؟

تعددِ ازدواج سوال ۔۔۔ قرآن کریم میں تعددِ ازدواج کی بابت ایک ہی آیت (۴:۳) ہے جو حقوقِ یتامیٰ کی حفاظت کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا آپ کے نزدیک جہاں حقوقِ یتامیٰ کا سوال نہ ہو وہاں تعددِ ازدواج کو ممنوع کیا جا سکتا ہے۔؟

جواب۔ یہ خیال غلط ہے کہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت کا حکم حقوقِ یتامیٰ کی حفاظت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ رائے بھی غلط ہے کہ جہاں حقوقِ یتامیٰ کا سوال نہ ہو وہاں تعددِ ازدواج کو ممنوع کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت مثالیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حکم بیان کرنے کے ساتھ ان حالات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن میں اس حکم کے بیان کی حاجت پیش آئی ہے، یا جن میں اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، یا جن سے وہ حکم متعلق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا اور کسی قانون داں آدمی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ ایسا حکم صرف انہی حالات کے ساتھ وابستہ ہے جن کا ذکر کر دیا گیا ہے، اور دوسرے تمام

حالات میں اس حکم پر عمل کرنا یا اس اجازت سے فائدہ اٹھانا ممنوع ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۳ میں فرمایا گیا ہے کہ "اگر تم سفر پر ہو اور (قرض کی دستاویز لکھنے کے لئے) تم کو کاتب نہ ملے تو پھر رہن باقبضہ ہونا چاہیئے"۔ کیا قانون کی سمجھ رکھنے والا کوئی آدمی اس کا یہ مطلب لے سکتا ہے کہ اسلامی شریعت میں رہن بالقبض کا جواز صرف سفر اور کاتب نہ ملنے کے ساتھ وابستہ ہے؟ اسی طرح سورۂ نساء کی آیت ۲۳ میں جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام کیا گیا ہے ان میں سوتیلی بیٹی کی حرمت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: "اور تمہاری وہ پروردہ لڑکیاں جو تمہاری گودوں میں ہیں تمہاری ان بیویوں سے جن کے ساتھ تم ہم بستر ہو چکے ہو"۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ سوتیلی بیٹی کی حرمت صرف اس حالت کے ساتھ وابستہ ہے جبکہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو؟ ان مثالوں سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ تعددازدواج کی اجازت جس آیت میں بیان ہوئی ہے اس کے ساتھ حقوقِ یتامیٰ کی حفاظت کے ذکر کرنے کا مقصد اس اجازت کو صرف اسی حالت کے ساتھ وابستہ کر دینا نہیں ہے جبکہ یتامیٰ کا کوئی معاملہ درپیش ہو۔ بلکہ اگر اس موقع و محل کو دیکھا جائے جس میں یہ آیت آئی ہے تو نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔ تعددازدواج اس آیت کے نزول سے پہلے عرب میں رائج تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود متعدد بیویاں رکھتے تھے، اور بکثرت صحابۂ کرام کے گھروں میں ایک سے زائد بیویاں موجود تھیں۔ قرآن میں اس کی کوئی ممانعت نہ آنا بجائے خود اس رواج کے جواز کے لئے کافی دلیل تھا۔ اس لئے یہ آیت دراصل تعددازدواج کی اجازت دینے کے لئے نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ جنگِ اُحد کے بعد اس کے نزول کا مقصد مسلمانوں کو یہ رہنمائی دینا تھا کہ جنگِ اُحد کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی شہادت سے یتامیٰ کی پرورش کا جو مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اس پر پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اس مسئلے کو تم لوگ تعددازدواج کے طریقے سے حل کر سکتے ہو جو پہلے ہی سے تمہارے لئے جائز ہے۔ اس طرح اس آیت نے کوئی نئی اجازت نہیں دی ہے بلکہ پہلے سے جو اجازت عملاً چلی آرہی تھی اس سے ایک خاص اجتماعی مسئلے کو حل کرنے میں مدد لینے کی تلقین کی ہے۔ البتہ نئی بات صرف اس میں یہ تھی کہ پہلے تعددازدواج غیر مقید تھا، اور اب اس کو زیادہ سے زیادہ چار کی حد کے ساتھ مقید کر دیا گیا۔ اس پس منظر سے جو شخص واقف ہو وہ کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ اس آیت میں تعددازدواج کی پہلی مرتبہ اجازت دی گئی تھی اور اس اجازت کو صرف اس حالت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا جبکہ یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش آئے۔

طلوعِ اسلام قرآن کی جس آیت کا سوال میں حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ...... (۴/۳)

اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتیموں[1] کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں، دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو۔

---

[1] عربی زبان میں یتیم اس عورت کو بھی کہا جاتا ہے جس کا شوہر نہ ہو (لسان العرب) خود قرآن میں بھی یَتٰمَی النِّسَآءِ آیا ہے۔ (۴/۱۲۷)

قرآن کی اس آیت کو دیکھئے اور پھر مودودی صاحب کی منطقی موشگافیوں کو۔ اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے اس دعوے کو بھی کہ اس کے احکام نہایت واضح، بیّن، صاف اور نکھرے ہوئے ہیں۔

تعدد ازدواج پر پابندی

سوال ـــ کیا آپ کے نزدیک یہ لازمی ہونا چاہیئے کہ عقد ثانی کا ارادہ رکھنے والا شخص عدالت سے اجازت حاصل کرے؟

جواب شریعت نے عقد اول اور عقد ثانی، ثالث و رابع میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ ان سب کی کھلی اجازت ہے۔ اگر عقد اول کسی عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط نہیں ہو سکتا تو ثانی کیا، ثالث و رابع بھی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کی تجویزیں صرف اسی صورت میں قابلِ غور ہو سکتی ہیں جبکہ پہلے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایک سے زائد نکاح کرنا ایک برائی ہے جس کو اگر روکا نہ جا سکے تو کم از کم اس پر پابندیاں ہی عائد ہونی چاہئیں۔ یہ نقطۂ نظر رومن لا کے فلسفۂ قانون کا ہے نہ کہ اسلام کے فلسفۂ قانون کا۔ اس لئے اسلامی قانون کی بحث میں ایسی تجویزیں لانا جن کا بنیادی تصور ہی اسلام کے تصور سے مختلف ہو اصولاً بالکل غلط ہے۔

طلوع اسلام

جی ہاں! مردوں کے اس اختیار پر قطعاً کوئی پابندی عائد نہیں کرنی چاہیئے! اسلام کا تو فلسفۂ قانون ہی یہ ہے کہ مرد کو چار بیویوں تک کی کھلی چھٹی ہو۔ پھر اس کے بعد اس کی چھٹی کہ وہ جب بھی چاہے ان میں سے ایک بیوی کو طلاق دے کر الگ کر دے اور اس کی جگہ ایک نئی بیوی لا کر چار کا کورم پورا کر لے اور ایسا کرتا چلا جائے۔ حتیٰ زنم للمقابر

کفالت کی بھی شرط نہیں

سوال ـــ کیا آپ کے نزدیک یہ قانون ہونا چاہیئے کہ عدالت یہ اجازت اس وقت تک نہیں دے سکتی جب تک اسے یہ اطمینان نہ ہو کہ درخواست دہندہ دونوں بیویوں اور اُن کی اولاد کی اس معیارِ زندگی کے مطابق کفالت کر سکتا ہے جس کے وہ عادی ہیں۔

جواب۔ اوپر کے جواب کے بعد یہ سوال آپ سے آپ خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز کی بعض کمزوریوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ عدالت عقد ثانی کی اجازت صرف اس صورت میں دے جبکہ ایک شخص دو بیویوں اور ان کی اولاد کی کفالت کر سکتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص ایک بیوی اور اس کی اولاد کی بھی کفالت نہ کر سکتا ہو اسے نکاح کی کھلی چھٹی کیوں ملی رہے؟ کیوں نہ ہر شخص کے عقد اول کا معاملہ بھی عدالت کی اجازت سے مشروط ہو اور اس کے لئے بھی یہ قید نہ لگا دی جائے کہ جب تک نکاح کا ہر خواہشمند عدالت کو اپنی مالی پوزیشن کے متعلق اطمینان نہ دلا دے اس وقت تک کسی کو نکاح کی اجازت نہ دی جائے؟ پھر یہ عجیب بات ہے کہ محبت اور سنجوگ اور خاندانی زندگی کے لطف و اطمینان کا ہر سوال نظر انداز کر کے اس ایک سوال کو نکاح ثانی کے معاملے میں اہمیت دی گئی ہے کہ یہ کام کرنے والا دو بیویوں اور ان کی اولاد کے مالی بار کا متحمل ہو سکے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عقد ثانی غریب اور متوسط طبقے کے لئے تو ممنوع ہو، مگر اونچے طبقے کے لئے یہ حق پوری طرح محفوظ رہے۔ اس سے بھی زیادہ دل چسپ کمزوری اس میں یہ ہے کہ عدالت صرف یہ دیکھ کر ایک شخص کو نکاح ثانی کی اجازت دیدے گی کہ وہ دو بیویوں اور ان کی اولاد کا متکفل ہو سکتا ہے، حالانکہ محض متکفل ہو سکنا عملاً متکفل ہونے کے لئے کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ہمارے

سامنے بکثرت مثالیں ایسے لوگوں کی موجود ہیں جو بڑی بڑی آمدنیاں رکھتے ہیں اور ایک بیوی کو نذرِ تغافل کئے رکھتے ہیں۔ عدالتوں کی اجازت کی قیدان خرابیوں کا آخر کیا سد باب کرتی ہے۔ ایسی خام تجویزوں کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم شریعت کے اس قاعدے ہی پر اکتفا کریں کہ ایک شخص ایک سے زائد نکاح کرنے کے معاملہ میں اپنی مرضی کا مختار ہو اور جس بیوی کو بھی اس سے کسی نوع کی بے انصافی کا شکوہ ہو اس کی دادرسی کے لئے عدالت کا دروازہ کھلا ہے۔

طلوعِ اسلام مودودی صاحب نے طنزاً کہا ہے کہ جس شخص کی آمدنی ایک بیوی کی کفالت کے لئے کافی نہ ہو اسے بھی نکاح کی اجازت نہیں ملنی چاہیئے۔ انہیں کون بتلائے کہ

ترے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے؛

خود اللہ میاں کا ارشاد ہے کہ جس شخص میں نکاح کی استطاعت نہ ہو وہ نکاح نہ کرے ضبطِ نفس سے کام لے۔

اور اس تجویز کی "خامی" سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے کہ دوسری بیوی کرنے والے کے متعلق کم از کم اتنا تو دیکھ لیا جائے کہ وہ اسے روٹی بھی کھلا سکے گا یا نہیں؟ اس لئے کہ مسلمان کا "ایمان" ہے کہ بیوی اپنی قسمت اپنے ساتھ لایا کرتی ہے۔ اس کے بعد بیوی کے رزق کی فکر کرنا، خدائی کاموں میں دخل انداز ہونا ہے۔

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

یتیم پوتے کی وراثت سوال۔ کیا قرآن کریم میں کوئی نص صریح موجود ہے یا کسی صحیح حدیث میں یہ تعلیم ملتی ہے کہ یتیم پوتے پوتی یا نواسے نواسی کو بہر حال محروم الارث کر دیا جائے؟

جواب یہ مسئلہ ان اصولی احکام سے خود بخود نکلتا ہے جو قرآن و حدیث میں تقسیم میراث کے متعلق دیئے گئے ہیں، اور اس کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں رد و بدل کر کے یتیم پوتے یا نواسے نواسی کو وارث بنانے کی جو صورت بھی تجویز کی جائے اس سے قانون میراث کا وہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے جو قرآن و سنت کے اصولی احکام پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام شروع سے آج تک اس پر متفق رہے ہیں۔ یہاں چونکہ اس مسئلے کی پوری توضیح ممکن نہیں ہے اس لئے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ جماعت اسلامی کے شائع کردہ پمفلٹ "پوتے کی وراثت کا مسئلہ" صفحہ ۹ تا ۴۰ ملاحظہ فرمائیں۔

طلوعِ اسلام یہ قانون کہ یتیم پوتے کو وراثت سے بھی محروم کر دیا جائے نہ صرف قرآن کے قانون میراث کے خلاف ہے بلکہ اس اصل الاصول کے بھی خلاف کہ یتیموں کے حقوق کا خاص طور پر خیال رکھا کرو۔ لیکن مولوی صاحب کو اس سے کیا غرض کہ قرآن کا قانون کیا ہے اور اس کی تعلیم کیا۔ اس نے تو یہ دیکھنا ہے کہ ہوتا کیا چلا آرہا ہے۔

طلاق اس عنوان کے ماتحت مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اسے درج کرتے وقت ہماری روح کانپ اٹھی ہے۔ آپ بھی ذرا غور سے دیکھئے۔

سوال ـــ اگر کوئی شوہر بیک وقت تین طلاقیں دے تو کیا آپ کے نزدیک اسے قطعی طلاق مغلظ شمار کیا جائے یا تین طہروں میں تین طلاقوں کے اعلان کے بغیر جیسا کہ قرآن میں ہدایت کی گئی ہے یہ مغلظ شمار نہ ہو۔

جواب۔ ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ تین طلاق اگر بیک وقت دیئے جائیں تو وہ تین ہی طلاق شمار ہوں گے، اور میرے نزدیک یہی صحیح ترین بات ہے، اس لئے میں یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ اس قاعدے میں کوئی تغیر کیا جائے۔ لیکن یہ امر مسلم ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے کیونکہ یہ اس صحیح طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور رسول نے اس کے طلاق دینے کے لئے سکھایا ہے۔ اس لئے اس غلط طریقے کی روک تھام ضرور ہونی چاہیئے۔ میری رائے میں اس غرض کے لئے حسب ذیل تدابیر مناسب ہوں گی۔

الف۔ مسلمانوں کو عام طور پر طلاق کے صحیح طریقے سے واقف کرایا جائے، اس کی حکمتیں اور اس کے فوائد سمجھائے جائیں، اور اس کے مقابلے میں طلاق بدعی کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے، نیز یہ بھی بتایا جائے کہ اس غلط طریقے سے طلاق دینے والا گناہگار ہوتا ہے۔ یہ چیز تعلیم کے نصاب میں بھی شامل ہونی چاہیئے۔ ریڈیو اور پریس کے ذریعہ سے بھی نشر ہونی چاہیئے، اور نکاح ناموں کے ساتھ جو احکام منسلک ہوں ان میں بھی اسے درج ہونا چاہیئے

ب۔ دستاویز نویسوں کو حکماً تین طلاق کی دستاویز لکھنے سے منع کر دیا جائے، اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے جرمانہ مقرر کر دیا جائے۔

ج۔ بیک وقت تین طلاق دینے والوں کے لئے بھی سزائے جرمانہ مقرر کر دی جائے۔ اس کے لئے ہمارے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کی نظیر موجود ہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی مجلس واحد میں تین طلاق دینے کا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوتا وہ طلاق کو نافذ کرنے کے ساتھ طلاق دینے والے کو سزا بھی دیتے تھے۔

آپ نے جواب ملاحظہ فرمالیا؛ مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ

(۱) بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے۔

(۲) یہ اس صحیح طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق دینے کے لئے سکھایا ہے لیکن اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ

> میرے نزدیک یہی صحیح ترین بات ہے (کہ بیک وقت تین طلاق کو تین شمار کیا جائے) اس لئے میں یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ اس قاعدے میں کوئی تغیر کیا جائے۔

یعنی ایک چیز گناہ ہے۔ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے باوجود، مودودی صاحب اسے صحیح ترقرار دیتے ہیں اور اس میں کسی تغیر کا مشورہ نہیں دیتے۔ اس کی دلیل؛ یہ کہ

> ائمہ اربعہ اور جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ تین طلاق اگر بیک وقت دیئے جائیں تو وہ تین ہی طلاق شمار ہوں گے۔

یا للعجب! ایک چیز گناہ بھی ہے۔ خدا اور رسول کے طریقے کے خلاف بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ائمۂ اربعہ اور جمہور فقہا کا اس پر اتفاق بھی ہے۔

اس باب میں، یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مولوی صاحبان کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں طریقہ یہ تھا کہ ایک ایک طہر کے وقفہ سے تین بار طلاق دی جاتی تھی۔ اور اس طرح تیسری طلاق کے بعد، طلاق بائن ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص ایک وقت میں تین مرتبہ طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہدیتا تو اسے ایک ہی مرتبہ کی طلاق شمار کیا جاتا۔ اس کے بعد، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ اگر کوئی شخص ایک وقت میں تین بار طلاق کہدے تو اسے تین مرتبہ کی طلاق تصور کر کے بائن قرار دیدیا جائے گا۔ اس وقت سے آج تک عمل، حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح (ایک ہی نشست میں) تین مرتبہ طلاق کہنا خدا اور رسول کے طریقہ کے خلاف ہے اور گناہ۔ لیکن جو شخص ایسا کہدے شریعت کا فیصلہ یہ ہوگا کہ اس نے اپنی بیوی کو "تین طلاق" دیدی۔ البتہ ایسا کرنے والے کو سزا دی جائے گی۔[1] اس کی مثال یوں سمجھئے کہ قرآن کی رو سے مشرک عورت سے نکاح جائز نہیں۔ اب اگر ایک مسلمان کسی مشرک عورت سے نکاح کر لیتا ہے تو مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ شریعت اس نکاح کو تو نکاح تسلیم کرے گی البتہ اس طرح نکاح کرنے والے کو کچھ سزا دیدے گی! حالانکہ بات صاف ہے کہ ایسا نکاح، شریعت کی رو سے نکاح تسلیم ہی نہیں کیا جائے گا۔ اور ایسا کرنے والے کو سزا ملے گی۔

اب اسے بھی ملاحظہ فرمائیے کہ مودودی صاحب اس "غلط طریقے" کی روک تھام کے لئے کیا تجاویز پیش فرماتے ہیں۔ یعنی

(۱) مسلمانوں کو طلاق کے صحیح طریقے سے واقف کرایا جائے۔

(۲) طلاق بدعی کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے۔

(۳) یہ بھی بتایا جائے کہ اس طرح طلاق دینے سے انسان گناہگار ہوتا ہے۔

(۴) یہ چیز نصاب تعلیم میں شامل کی جائے۔

(۵) ریڈیو اور پریس کے ذریعے اس کی نشر و اشاعت کی جائے۔

(۶) دستاویز نویسوں کو بیک وقت تین طلاق کی دستاویز لکھنے سے منع کر دیا جائے۔

(۷) بیک وقت تین طلاق دینے والوں کے لئے سزائے جرمانہ مقرر کی جائے۔

آپ اس فہرست کو دیکھ کر کہہ اٹھیں گے کہ اس طرح "بگلے کے سر پر موم رکھ کر بگلا پکڑنے" کے بجائے، سیدھے طور پر یہ کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ جو شخص ایک وقت میں تین بار طلاق کہے گا، قانوناً اسے ایک ہی طلاق تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن آپ بہت بھولے دانش ہوئے ہیں۔ میدان سیاست میں آئیے تو آپ کو پتہ چلے کہ سیدھے طور پر بات کہدینے میں کس قدر خطرات مضمر ہوتے ہیں۔ کوئی

---

[1] اس کی تائید میں مودودی صاحب نے حضرت عمرؓ کی نظیر بھی پیش کر دی۔ ہماری روایات میں ڈھونڈنے والے کو کیا کچھ نہیں مل جاتا؟

بچ بیٹھے ہوئے، غلطی سے مودودی صاحب کے منہ سے ایک سیدھی بات نکل گئی تھی (جب انہوں نے برکت علی محمڈن ہال میں کہدیا تھا کہ بخاری شریف کی روایات پر بھی تنقید کی جا سکتی ہے) اُس وقت سے آج تک وہ اس کا کفارہ دیتے پھر رہے ہیں۔ اب آپ کا مشورہ یہ ہے کہ وہ اس قسم کی حماقت پھر کر ڈالیں؟ یاد رکھئے۔ "مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ کبھی نہیں ڈسا جایا کرتا"! پھر اُدھر سر پر الیکشن بھی تو آ رہا ہے! ملک میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کا مسلک یہ ہے کہ ایک وقت میں تین مرتبہ طلاق کہدینے سے طلاق بائن ہو جاتی ہے۔ مودودی صاحب انہیں بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی جماعت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو" خدا اور رسول کے حکم کے مطابق" اس قسم کی طلاق کو ایک ہی طلاق تصور کرتے ہیں۔ مودودی صاحب انہیں بھی ناراض نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کا مشورہ یہ ہے کہ

(۱) بیک وقت تین مرتبہ طلاق کہدینے سے طلاق کو بائن تسلیم کیا جائے لیکن

(۲) ایسا کہنے والے کو گناہگار ٹھیرایا جائے۔

لیجئے ـــــ گاندھی جی بھی خوش رہے۔ راضی رہی سرکار بھی!

یہ ہیں وہ لوگ جو اس بدقسمت ملک میں "اقامت دین" کے مقدس مشن کو لے کر اٹھے ہیں اور جن کے ہاتھوں (خدا نکردہ) "اسلامی قانون" مرتب ہونا ہے۔

(واضح رہے کہ سطور بالا میں ہم نے انہی حضرات کے مسلک کو سامنے رکھ کر بات کی ہے ورنہ قرآن کی رُو سے طلاق کا جو صحیح طریقہ ہے وہ پرویز صاحب کے جواب میں درج ہے۔)

مِزاجِ شناسِ رسُول

یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول؛ مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۴ صفحات قیمت چار روپے

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

یاد ایامے کہ.....

حصول پاکستان کے بعد، قوم، مالِ غنیمت (نہیں بلکہ مالِ فے) کی تقسیم میں اس قدر جذب ہوگئی کہ اسے اپنے پرلے سب بھول گئے۔ (مالِ فے اسے کہتے ہیں جو دشمن سے جنگ کئے بغیر ہاتھ آجائے)۔ حتیٰ کہ یہ اقبال کو بھی بھول گئی جس نے پاکستان کا تصور دیا تھا اور جناح کو بھی جس نے اس تصور کی عملی تشکیل کی۔ اقبال کا نام کبھی کبھار ریڈیو پاکستان سے صلہ کی تھاپ کے ساتھ سنائی دیتا ہے۔ باقی رہا جناح، سو اس کی یاد تازہ کرنے کا صرف یہ طریقہ رہ گیا ہے کہ جب کوئی نیا وزیر مسند وزارت کو سرفراز کرتا ہے تو وہ عہدہ سنبھالنے کے بعد سیدھا قائدِ اعظم کے مزار پر حاضری دینے کے لئے چلا جاتا ہے۔ (اس بدعت سے ہمیں وہ پرانی رسم یاد آجاتی ہے جس کی رُو سے، شادی کے دن دولہا کو گھوڑی پر چڑھا کر پیر صاحب کے مزار پر سلام کے لئے لیجایا کرتے تھے!) یا جب کسی کو اپنے کسی مقصد کے لئے مزدرت پڑتی ہے تو وہ قائدِ اعظم کا کوئی ایسا قول دہرا دیتا ہے جو اس کے مفید مطلب ہو۔ واضح رہے کہ ہمارے نزدیک نہ اقبال کی ہر بات سند ہے۔ نہ قائدِ اعظم کی۔ نہ کسی اور انسان کی۔ سندِ مطلق صرف خدا کی کتاب ہے۔ لیکن اپنے محسنوں کی ان خوبیوں کو یاد نہ کرنا جن کی بنا پر انہوں نے ہمارے لئے اتنا کچھ کیا تھا، اپنے ناخلف ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ آج کی نشست میں ہم محترم قائدِ اعظم کی ایک ایسی خصوصیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کا شہرہ دور دور تک تھا اور جس کی وجہ سے انہیں عصرِ حاضر کے سیاسی راہ نماؤں میں بلند مقام حاصل تھا۔ وہ خصوصیت تھی ان کی صاف گوئی۔ جرأت اور بے باکی۔ لگی لپٹی بغیر سیدھی سیدھی بات کہدینا۔

قائدِ اعظم اگرچہ کوئی اسکالر نہیں تھے لیکن انہیں انگریزی زبان پر جس قدر عبور تھا وہ ان کی تقاریر، بیانات، پیغامات اور خطابات سے ظاہر ہے۔ ان کی تقریر اور تحریر دونوں فی البدیہہ (EX — TEMPORE) ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے صدارتی خطابات بھی۔ لیکن ان سب میں ان کا خاص انداز ہر جگہ نمایاں ہوتا تھا۔ یہ انداز ان کے خطوط میں اور بھی ابھر کر سامنے آجاتا تھا۔ اور جب مخاطب مسٹر گاندھی ہوتے تو یہ چیز اپنی انتہا تک پہنچ جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ محترم قائدِ اعظم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے گاندھوی طلسم کو اس طرح توڑا کہ ساری دنیا نے اسے بے نقاب دیکھ لیا۔ گاندھی جی جس انداز مہاتمائی سے اٹھے اور بڑھے تھے، اگر قائدِ اعظم مرحوم کی عقابی نگاہیں اسے نہ بھانپتیں اور ان کا جرأت آموز اور صداقت آمیز تدبر اس کا راستہ نہ روکتا، تو اس وقت مسلمانوں کا جو حشر ہوتا اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ قوم کی آنے والی نسلوں کو اس نبرد آزمائی کی حقیقت سے باخبر رکھنے کے لئے، ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ "گاندھی۔ جناح" کی پوری خط و کتابت، ضروری حواشی کے ساتھ،

مستند طریق سے شائع کی جائے۔ یہ بڑا دلچسپ، سبق آموز اور دیدہ کشا مجموعہ ہوگا۔ ہم ذیل میں اس مجموعہ میں سے صرف ایک خط نمونۃً پیش کرتے ہیں اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس خط وکتابت کا انداز کیا تھا اور محترم قائداعظم کا مقام کیا؟ یہ خط جنوری ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت مسٹر گاندھی کی یہ پوزیشن تھی کہ ان کے ایک اشارے پر تیس کروڑ ہندو (اور نیشنلسٹ مسلمان) انگریزوں جیسی طاقت کے مقابلہ میں آمادۂ بغاوت ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف قائداعظم اگرچہ مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن اس مسلم لیگ کی حالت، خود ان کے الفاظ میں اس سے زیادہ نہ تھی کہ۔

مسلم لیگ، نام ہے تمہارے صدر اور اس کے ایک ٹائپ کیس کا۔!

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ قائداعظم کا مدمقابل کون تھا اور ان کا ٹکراؤ کس بے پناہ قوت کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اتنی بڑی بے پناہ قوت کے حامل "مہاتما گاندھی" کو قائداعظم کس انداز سے جواب دیا کرتے تھے۔ سوچئے کہ ایسا جواب دینے کے لئے کس قدر صداقت، جرأت اور بے باکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے اچھی طرح یاد رکھئے کہ قائداعظم وضع اور سلیقہ کے اس قدر پابند تھے کہ بدتمیزی یا ناشائستگی کا ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نہیں نکلا کرتا تھا۔ لہٰذا جس بات کو آپ خط میں دیکھیں گے وہ جرأت اور بے باکی ہے۔ بدتمیزی اور بدسلیقگی نہیں اس کے ساتھ ہی شگفتگی اور تبسم زیر لبی بھی! (ان باتوں کا حقیقی لطف تو خط کی اصل زبان، انگریزی ہی سے مل سکتا ہے۔ بایں ہمہ، ہم کوشش کریں گے کہ اس کے آزاد ترجمہ میں اس کا کچھ نہ کچھ انداز آجائے) خط یہ ہے۔

ڈیر مسٹر گاندھی

مجھے آپ کا خط ملا۔ اور اس مضمون کی نقل بھی جسے آپ نے ہریجن میں بغرض اشاعت بھیجا ہے۔ میں نہ صرف آپ کے اس حسن اخلاق کے لئے سپاس گذار ہوں بلکہ اس تشویش کے لئے بھی جو آپ کو میرے اس مقصد کے آگے بڑھانے کے سلسلہ میں لاحق ہو رہی ہے، جسے آپ میرے پیغامات اور تنگ وتاز میں محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے وہ تمام مفروضے غلط ہیں (جن پر آپ اپنے منطق کی عمارت استوار کر رہے ہیں)۔ آپ آغاز سخن "ہندوستانی قوم" (انڈین نیشن) کے نظریہ سے کرتے ہیں جس کا کہیں وجود ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کے منطق کی خشت اول ہی ٹیڑھی ہے تو اس پر اٹھائی ہوئی دیوار کس طرح سیدھی ہو سکتی ہے؟ لہٰذا اس غلط مفروضہ سے آپ جن نتائج تک پہنچیں گے وہ سب غلط ہوں گے۔ مجھے اتنا خیال ضرور تھا کہ کم از کم آپ اخبارات کی یک طرفہ رپورٹوں اور ان کی افسانہ تراشیوں اور افتراپردازیوں سے بہک نہیں جائیں گے۔ لیکن آپ کے مضمون کا بیشتر حصہ بھی محض آپ کے تخیل کی خلاقی ہے۔ حقیقت پر مبنی نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آپ سیوگاؤں کے بھوسے میں تخلیہ کی زندگی بسر کرتے ہیں (اس لئے آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے) اور دوسری وجہ یہ کہ آپ کے تمام خیالات اور حرکات آپ کی "اندرونی آواز" کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ آپ کو حقائق سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ یا یوں کہئے کہ اس چیز سے کچھ واسطہ نہیں جسے ایک عام فانی انسان "عملی سیاسیات" سے تعبیر کرتا ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی اس پر تعجب ہوتا ہے کہ بالآخر آپ ہیں اور عملی سیاسیات ہیں کون؟ یا تنہا مشترکہ ... یا جمہوریت ہیں اور ایک ایسی سیاسی جماعت کے ڈکٹیٹر ہیں، جس کا وہ "چار آنہ" کا ممبر بھی نہیں؟ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ آپ ...

کانگریس اس قابل ہی نہیں کہ آپ اس کے ممبر بنیں۔ (آپ اسے اپنی کسر شان سمجھتے ہیں!)

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ "یوم نجات" پر میرے ہدیۂ تہنیت نے آپ کو طلسم پیچ و تاب نہیں بنا دیا۔ "قائد اعظم جناح زندہ باد" کی خاموش دعا میں آپ کی شرکت آپ کی شرافت کی دلیل ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن بایں ہمہ، مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ آپ نے یوم نجات" کے حقیقی مفہوم اور اس کی اہمیت کو محسوس کر لیا ہے۔

یہ خبر درست ہے کہ بہت سے غیر کانگریسی ہندوؤں نے ہمارے مطالبہ کی صداقت اور ہمارے دعوے کے مبنی بر انصاف ہونے کی بنا پر "یوم نجات" پر ہم سے اظہار ہمدردی کیا ہے۔ نیز جسٹس پارٹی کے لیڈروں، اچھوت اقوام اور پارسیوں نے بھی، جنہوں نے کانگریسی راج کے ہاتھوں مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ان کے اس اظہار ہمدردی کو جو معنی پہنائے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس کے صحیح مفہوم کو سمجھے ہی نہیں۔ ان کا یہ عمل اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ مشترکہ مصیبتیں کس طرح اجنبیوں کو بھی ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہیں۔ اور اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ باہمی مفاد کا اشتراک مسلمانوں اور اقلیتوں میں کس طرح اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ میں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتا ہوں۔ اور اس باب میں مجھے کسی قسم کا دھوکہ ہے نہ شک و شبہ۔ کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ایک ملک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن (آپ کو یاد ہوگا کہ) جب آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ قوت محرکہ کونسی ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے کیا وہ مذہب ہے۔ سیاست ہے۔ یا عمرانی (سوشل) اصلاح ہے — تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ ایک مرتبہ میں ایک ایسے وفد کے ساتھ سر مانٹیگو کے پاس گیا جو خالصتہً سیاسی تھا۔ مانٹیگو نے مجھ سے کہا کہ تم ایک سوشل ریفارمر ہو۔ تم اس سیاسی جھگڑے میں کیسے شریک ہو گئے؟ میں نے جواب میں کہا کہ یہ بھی میرے سوشل کاموں کا ایک نوعیتی گوشہ ہے۔ اگر میں تمام نوع انسانی کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اگر میں اپنے آپ کو ان میں کا ایک محسوس نہیں کرتا۔ تو میری زندگی قطعاً مذہبی زندگی نہیں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا ناممکن ہے جب تک میں سیاسیات میں حصہ نہ لوں (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و عمل کا دائرہ ایک ناقابل تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوع انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب، انسان کے ہر عمل کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں، محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں

لہ جب ہندوستان میں کانگریس نے وزارتوں سے استعفیٰ دیا تو سارے ملک میں مسلمانوں نے "یوم نجات" منایا کہ اللہ نے انہیں تنگ نظر ہندو کی حکومت سے نجات دلائی ہے۔ اس پر سارا ہندو پریس اور ہندو جاتی سٹپٹا اٹھی تھی۔

شور وشغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں۔

آج اس ملک میں آپ سے بہتر اور کوئی شخص ایسا نہیں جسے ہندوؤں کا اس قدر اعتماد حاصل ہو اور جو ان کے نمائندہ کی حیثیت سے معاملات کا آخری فیصلہ کر سکے۔ ان حالات میں اگر آپ سے یہ توقع کی جائے کہ آپ سراب کے پیچھے لپکنے کے بجائے (دنیائے حقیقت کی طرف آئیں اور) جس کام کے آپ اہل ہیں اسے سرانجام دیں، تو میرا خیال ہے کہ یہ توقع کچھ زیادہ اور یہ امید موہوم نہیں قرار دی جانی چاہیئے۔۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں اور واقعات برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ آپ کی مناظرہ بازی۔ یا ہر ہفتہ ہر کہیں (اخبار) میں مابعد الطبیعیات، فلسفہ اور اخلاقیات پر اپدیش۔ یا چرخہ، کھدر اور اہمسا کے متعلق آپ کے انوکھے نظریات، ہندوستان کو آزادی نہیں دلا سکتے۔ عمل اور صحیح سیاسی تدبر ہی ہمارا قدم ہماری منزل مقصود کی طرف بڑھا سکتا ہے۔ میں نے یہ کچھ اس خیال سے کہا ہے کہ آپ شاید (حقائق کو سامنے رکھ کر) اپنی پوری توانائی اور استعداد کے ساتھ ملک کی بہبود کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور قدرت نے جو صلاحیتیں آپ کو دی ہیں انہیں اہل ملک کی مرفہ الحالی کے لئے صرف کریں۔

آپ کو اس سوال نے بڑا پریشان کر رکھا ہے کہ میرے نام کے ساتھ القاب کون سے استعمال کئے جائیں۔ آپ کی اس تشویش کا شکریہ، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ القاب میں بالآخر رکھا کیا ہے؟ پھول کو کسی نام سے پکاریئے اس کی خوشبو میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ لہٰذا یہ معاملہ میں آپ پر ہی چھوڑتا ہوں۔ مجھے اس سے چنداں دلچسپی نہیں۔ اس پر البتہ تعجب ضرور ہے کہ آپ اس غم میں کیوں گھلے جا رہے ہیں؟ (براہ مہربانی سنیئے تو ایک بات عرض کروں!) آپ نے لکھا ہے کہ آپ موجودہ القاب ان آداب معاشرہ کے مطابق استعمال کر رہے ہیں جو آپ نے حکیم صاحب مرحوم سے سیکھے تھے۔ لیکن حیرت ہے کہ خود حکیم صاحب کی زندگی میں، اور ان کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک بھی، آپ مجھے (حکیم صاحب کے سکھائے ہوئے القاب سے نہیں بلکہ) محض "مسٹر" کہہ کر پکارتے رہے۔ پھر مجھے "مسٹری" کے لقب سے بھی یاد فرماتے رہے۔ اور ان دونوں کے درمیان "دوست" کہہ کر بھی!

لیکن چھوڑیئے ان باتوں کو۔ القاب میں بالآخر کیا رکھا ہے؟

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

ہم نے اس خط کو اس لئے شائع کیا ہے کہ

(۱) ہمارے ارباب حل وعقد جو آٹھ برس سے پنڈت نہرو سے مختلف فیہ معاملات پر گفت وشنید کر رہے ہیں، انہیں معلوم ہو جائے کہ ہندو کونسی زبان سمجھا کرتا ہے۔ اور

(۲) آج جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ مذہب کا رشتہ نہایت کمزور رشتہ ہے اور قومیت کی تشکیل اشتراک وطن کی بنا پر ہوتی ہے نہ کہ وحدت مذہب کی بنا پر، انہیں (اگر خدا اور رسول کے ارشادات سے کچھ دلچسپی نہیں تو کم از کم وہ) یہی دیکھ لیں کہ خود قائد اعظم کا اس باب میں کیا خیال تھا اور ان کے نزدیک انسانی زندگی میں مذہب کی صحیح پوزیشن کیا تھی۔

حقائق و عبر

۱۔ انسانیت کے محسن

حیوان اور انسان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے جس قدر علم کی ضرورت ہوتی ہے وہ پیدائش کے ساتھ ہی اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا جاتا ہے اسے حیوانات کی جبلت یا (INSTINCT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک حیوان کو زندگی بھر نہ حصولِ علم کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی مختلف تجارب کے بعد صحیح راستہ اختیار کرنے کی حاجت۔ وہ جو کچھ پہلے دن ہوتا ہے وہی کچھ آخری دن تک رہتا ہے (بجز اس کے کہ انسان اسے پکڑ کر اپنی مرضی کے مطابق کچھ حرکتیں کرنا سکھا دے) اس کے برعکس، انسان کی کیفیت بالکل مختلف ہے۔ انسانی بچہ (بجز چند حیوانی خصوصیات کے) بالکل کورا پیدا ہوتا ہے اور اسے زندگی بسر کرنے کے لئے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکتسابِ علم کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہم سے پہلے انسانوں نے کیا ہے اس کی بابت پوری پوری معلومات حاصل کی جائیں۔ اور جن مسائلِ حیات کے متعلق کوئی بات حتمی طور پر طے نہیں پا سکی، ان کے متعلق نئے نئے تجربات سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ نئے تجربات میں انسان کو بڑی بڑی مشقتیں اٹھانی پڑتی اور بڑے بڑے صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ بنا بریں (حضرات انبیاء کرام کے بعد) انسانیت کے سب سے بڑے محسن وہ لوگ ہیں جو اپنے سر پر مصیبتیں لے کر، جاں گسل تجارب کے بعد، کسی حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں اور اس طرح نوعِ انسانی پر کشائش کی راہ کھول دیتے ہیں۔ مختلف مصنوعات اور ادویات کے موجد اور حقائقِ کائنات کے مکتشف اسی زمرہ میں شامل ہیں ... ... ان لوگوں کے کوائفِ حیات، تاریخ کے اوراق پر زریں حروف میں لکھے ملتے ہیں تاکہ وہ آنے والے انسانوں کے لئے روشنی کے مینار کا کام دیں۔ اسی سلسلہ میں حال ہی میں ایک ایسی خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے جس کا ذکر کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔

انگلستان میں مجرمین کو موت کی سزا پھانسی کے ذریعے دی جاتی ہے۔ لیکن بعض ممالک نے اس کی جگہ "بجلی کی کرسی" (ELECTRIC CHAIR) کو اختیار کیا ہے جس میں بجلی کے شدید جھٹکے سے زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں کچھ وقت سے ایک تحریک جاری ہے کہ سزائے موت کے لئے پھانسی کی جگہ "بجلی کی کرسی" کو اختیار کیا جائے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ پھانسی کا طریق بڑا ظالمانہ اور وحشیانہ ہے۔ اس سے مرنے والے کو سخت اذیت ہوتی ہے۔ برعکس اس کے، بجلی کے ذریعے سزائے موت رحمدلانہ طریقہ ہے کیونکہ اس میں اتنی جلدی موت واقع ہو جاتی ہے کہ مرنے والے کو اپنی موت کی خبر تک نہیں ہونے پاتی۔ اس تحریک

کے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے کہ بجلی سے موت آناً فاناً واقع ہو جاتی ہے، بلکہ آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ پھانسی سے موت ایک لمحہ میں واقع ہو جاتی ہے۔ ان دونوں فریقوں میں یہ نزاع ایک عرصہ سے جاری ہے۔ ظاہر ہے کہ منطقی دلائل سے اس کے متعلق کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ پھانسی کے ذریعہ موت یک لخت واقع ہوتی ہے یا نہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے کیا تجویز پیش ہوئی ہے؟ اپنا کلیجہ تھامئے اور سنئے! پھانسی کو وحشیانہ طریق قرار دینے والوں کے لیڈر نے کہا ہے کہ

> میں اپنے آپ کو پھانسی کے لئے پیش کرتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جونہی مجھے پھانسی کا جھٹکا لگے، پھانسی کی رسی فوراً کاٹ دی جائے۔ اگر میں اس ایک جھٹکے سے مر گیا تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ پھانسی سے فی الواقعہ یک لخت موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور اگر میں زندہ رہا تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ اس سے یک لخت موت وارد نہیں ہوتی۔ اس صورت میں حکومت پر لازم آجائے گا کہ پھانسی کے طریقہ کو منسوخ کر دے۔

غور کیجئے کہ یہ پیش کش کس قدر ایثار اور حوصلے کی آئینہ دار ہے؟ اور یہ کس لئے پیش کی جا رہی ہے؟ اس لئے کہ مرنے والے مجرمین، موت کی اذیت سے چھٹکارا پا جائیں! کتنا جانکاہ ہے یہ تجربہ، اور انسانیت کا کس قدر درد ہے اس کے سینے میں جس نے اپنے آپ کو اس تجربے کے لئے پیش کیا ہے؟

اور آپ کو معلوم ہے کہ اپنے آپ کو اس تجربے کے لئے پیش کرنے والا کون ہے؟ کوئی بڑا لیڈر نہیں۔ کوئی مذہبی پیشوا نہیں۔ کوئی بین الاقوامی شہرت کا مالک فلاسفر نہیں۔ یہ ایک معمولی نان بائی (BAKER) ہے۔

زندگی کی حرارت بھی بعض اوقات کیسے کیسے گمنام سینوں میں مضمر ملتی ہے۔

اتنا لکھا جا چکا تھا کہ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت انگلستان نے سزائے موت ہی کو کالعدم قرار دیدیا ہے۔ اس وقت ہم سزائے موت کے مسئلہ کے متعلق گفتگو نہیں کر رہے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک فرد کا جرأت مندانہ ایثار کتنے بڑے نتیجہ کا موجب بن سکتا ہے ایک بیکر کی جاں فروشانہ پیش کش نے کس طرح ایک سلطنت کی قانونی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔

۲- دورِ بربریت کی یادگار

انسان نے حیوانات سے جو چند خصوصیتیں ورثہ میں پائی ہیں ان میں سب سے زیادہ شدید باہمی جنگ و قتال کی خصلت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہی خصوصیت، حق کی حمایت میں بروئے کار آئے تو یہ نوعِ انسانی کے لئے بڑی نفع بخش ثابت ہوتی ہے لیکن تاریخ انسانیت اس پر شاہد ہے کہ اس قوت کو حق کی حمایت کی بجائے بالعموم باہمی عداوت اور انتقام یا اسی قسم کے دیگر مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

جب انسان دورِ وحشت و بربریت سے منزلِ تہذیب و تمدن کی طرف آیا تو بعض سوچنے والے دماغوں نے اس کے اس جذبۂ تصادم

رقابت کی تسکین کے لئے جنگ کی بجائے ایک پُرامن صورت پیدا کی۔ یہ پُرامن صورت ہے کھیل کا میدان (SPORTS) اس میں دو ٹیمیں بالکل اسی طرح آمنے سامنے آتی ہیں جس طرح دو فوجیں ایک دوسرے پر آمادۂ یلغار ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ فریقِ مقابل کو شکست دے۔ علمائے نفسیات کا کہنا ہے کہ اس سے انسان کے جذبۂ تصادم کی تسکین بھی ہو جاتی ہے اور خونریزی بھی نہیں ہوتی۔

لیکن حیرت ہے کہ اس دورِ تہذیب و تمدن میں ہنوز ایسی کھیلیں بھی موجود ہیں جن میں کھیلنے والے کی کوشش دوسرے کو محض شکست دینا نہیں ہوتی بلکہ اس کی ہڈی پسلی توڑنے اور بعض اوقات اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی ہوتی ہے۔ ان میں ہسپانیہ کی (BULL – FIGHTING) کے علاوہ (کہ جس میں انسان کا فریقِ مقابل ایک حیوان ہوتا ہے) آزاد کشتی (FREE – STYLE WRESTLING) اور مُکّہ بازی (BOXING) ہے۔ جنہوں نے ان کھیلوں کو دیکھا ہے وہ اس سے متفق ہوں گے کہ ان میں وحشت و خونخواری کا جذبہ اپنی انتہائی شدت پر ہوتا ہے۔ اس کا عملی ثبوت حال ہی کا ایک واقعہ ہے جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ گلاسگو (انگلستان) میں، ایک سکاچ اور مغربی انگلستان کی مُکّہ بازی کا "دنگل" ہوا۔ اس میں انگلستانی مکّہ باز نے اپنے فریقِ مقابل کو ایک ایسا گھونسہ رسید کیا جس سے وہ بے ہوش ہو گیا اور ہسپتال جا کر مر گیا۔

قانون کی رُو سے نہ اس قاتل سے کوئی بازپُرس ہو سکتی ہے نہ مقتول کے خوں بہا کا سوال پیدا ہوتا ہے؛ نہ ہی ایسی جان لیوا کھیل کو آئندہ کے لئے ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ انسان باایں ہمہ ادعائے تہذیب و تمدن، ہنوز کس قدر حیوانیت اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔؟

لیکن اس "حیوانیت" کے ثبوت کے لئے کسی مکّہ باز کی موت کی بھی کیا ضرورت ہے؟ کیا ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ گذشتہ دو عالمگیر لڑائیوں میں تمام مہذب اقوامِ عالم نے کس قدر حیوانیت کا ثبوت دیا ہے۔ اور اب آئندہ جنگ کے لئے جو تیاریاں ہو رہی ہیں وہ کس قسم کی "انسانیت" کی غماز ہیں۔ کیا سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ

انساں کہ رُخ ز غازۂ تہذیب برفروخت　　　خاکِ سیاہ خویش چو آئینہ وا نمود
پوشیدہ پنجہ راتہ دستانۂ حریر　　　افسونِ قلم شد و تیغ از کمر کشود
ایں بوالہوس صنم کدۂ صلح عام ساخت　　　رقصید گرد او بنوا ہائے چنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموس او درید
جز "یَسۡفِکُ الدِّمَاءَ" و "خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ" نبود　　　(اقبال)

انسان کی اس درندگی اور خونخواری کو کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ، قلبی و ذہنی انقلاب ہے جو قرآن کی رو سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ انقلاب جس میں حق اور قوت ایک دوسرے کے رفیق بن کر خود جنگ سے اس کے ہتھیار رکھوا لیتے ہیں حتیٰ تضع الحرب اوزارھا۔ (سورۂ قتال)

۳- جواب آگیا

ہم نے طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ (ایک صاحب کے بیان کے مطابق) چوہدری غلام محمد صاحب قیم جماعت اسلامی، سندھ، نے کہا ہے کہ طلوع اسلام کو مرکزی حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپیہ کی امداد منظور ہوئی تھی جس میں سے بیس ہزار کی رقم مل چکی تھی کہ چوہدری محمد علی صاحب آگئے اور انہوں نے اس امداد کو بند کر دیا۔ ہم نے چوہدری غلام محمد صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس میں استدعا کیا تھا کہ اگر انہوں نے ایسی بات نہیں کہی تو اس کی تردید فرما دیں اور اگر کہی ہے تو اس کا ثبوت پیش کریں۔ جواب کے لئے ہم نے ساڑھے پانچ آنے کے ٹکٹ بھی لفافہ میں رکھ دیئے تھے۔

اب قریب پونے دو ماہ کے بعد ہمیں، دفتر مکتبہ چراغ راہ، کراچی، کی طرف سے، حسب ذیل خط موصول ہوا ہے جس میں نہ کسی سے خطاب ہے نہ سلام علیک۔ (یعنی یہ حضرات ارباب طلوع اسلام کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ان سے اسلامی شعار اور عام ضابطۂ اخلاق کے آداب بھی روا رکھے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں، مرزائی حضرات کی طرح، تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ اپنی جماعت سے باہر کے لوگوں کو مسلمان ہی نہ سمجھا جائے) خط کے الفاظ یہ ہیں،

> آپ نے محترم چوہدری غلام محمد صاحب کو اپنے ایک خط کے ساتھ ساڑھے پانچ آنے کے جو ٹکٹ ارسال کئے تھے وہ ٹکٹ آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔

یعنی انہوں نے ٹکٹ واپس ارسال فرما کر دنیا پر اپنی دیانت کا اظہار کر دیا۔ باقی رہی بہتان تراشی سو وہ کوئی ایسی اہم بات نہیں جو ان حضرات کے نزدیک درخور توجہ ہو۔ اس لئے کہ یہ تو ان کے معمول میں داخل ہے۔

۴- اخلاقی جرأت

جماعت اسلامی کے ترجمان، المنیر (لائل پور) میں عبدالغفار حسن صاحب کے قلم سے حسب ذیل شذرہ شائع ہوا۔

> "طلوع اسلام اپنی اشاعت مورخہ ۲۵ جون ۱۹۵۵ء میں لکھتا ہے کہ "جماعت اسلامی کے نزدیک دین کے ہر معاملہ میں سند ان کے امیر مودودی صاحب ہیں۔ چنانچہ جب وہ جہاد کشمیر کے سلسلہ میں قید ہوئے ہیں تو اس جماعت کے قیم محترم طفیل محمد صاحب نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ مولانا اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور سند ہیں" (قاصد کشمیر نمبر بحوالہ الفرقان بابت مئی۔ جون ۱۹۵۵ء) صفحہ ۹۱
>
> قیم جماعت اسلامی کی طرف منسوب کردہ عبارت قاصد کشمیر میں تلاش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی احتیاطاً الفرقان لکھنؤ بابت ماہ مئی جون بھی دیکھا گیا لیکن اس میں بھی یہ حوالہ نہیں ملا۔
>
> نہ "علوم الفرقان" سے کونسا الفرقان" مراد ہے۔ بہرحال طفیل محمد صاحب نے اس قسم کی عبارت قاصد کشمیر نمبر تو کجا کہیں بھی نہیں لکھی ہے اور نہ جماعت اسلامی کا کوئی رکن اس نظریہ کا قائل ہے۔

کیا ادارۂ طلوع اسلام اس کا صحیح حوالہ دے سکتا ہے؟ اور اگر یہ الزام غلط ہے (اور واقعتہً غلط ہی ہے) تو کیا اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرے؟"

المنیرہ لائل پور۔ ۲۷ جنوری ۱۹۵۶ء

آپ خط کشیدہ الفاظ پر ایک دفعہ پھر غور فرمائیں جن میں کس حتم: یقین سے کہا گیا ہے کہ طفیل محمد صاحب نے اس قسم کی عبارت، قاصد (کشمیر نمبر) میں تو کجا کہیں بھی نہیں لکھی ہے..... اور طلوع اسلام کا الزام واقعتہً غلط ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔ چونکہ طلوع اسلام نے یہ واقعہ الفرقان۔ کے حوالہ سے لکھا تھا اس لئے الفرقان نے (اپنی جنوری ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں) اس کا حسب ذیل جواب شائع کیا۔

یہ حوالہ میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی" کے مضمون "مسئلہ کشمیر اور جماعت اسلامی" میں موجود ہے۔ روزنامہ قاصد لاہور کے کشمیر نمبر مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۱۱ پر یہ الفاظ ہیں:۔

پاکستان، ہندوستان، آزاد قبائل اور کشمیر ہر جگہ کے لوگوں کے نزدیک مولانا (ابوالاعلیٰ صاحب) اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور ہیں؛

اخبار قاصد کا کشمیر نمبر ہمارے پاس موجود ہے اگر جناب ایڈیٹر صاحب المنیر چاہیں تو انہیں دکھا سکتے ہیں۔ مولانا حسن صاحب بھی اب کیا فرماتے ہیں۔

مولانا حسن صاحب اور المنیر اب کیا فرمائیں گے؟ اب تو ان کی "اخلاقی جرأت" کا تقاضا یہی ہوگا کہ (حسب معمول) چپ سادھ جائیں اور اس طرح اپنی جماعت کو اس فریب۔ سے نکلنے نہ دیں کہ طلوع اسلام ہمارے خلاف غلط الزامات عائد کرتا رہتا ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری!!

۵- ذرا نگاہیں جھکا لیجئے!

سال گذشتہ، مراکو کے بے، کی جلاوطنی اور اس کے "حرم" کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ حال ہی میں (NORTH AFRICAN JOURNEY) کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مصنف (BERNARD NEWMAN) ہیں۔ اس کتاب میں بے موصوف اور ان کے "حرم" کے کچھ حالات درج ہیں جنہیں ملاحظہ فرماتے وقت شرم سے اپنی نگاہیں جھکا لیجئے۔ کتاب میں لکھا ہے کہ بے کے حرم میں تین سو پچاس لونڈیاں تھیں۔ یعنی یہ تعداد ہر وقت موجود رہتی تھی۔ جب بے کسی لونڈی سے ناراض ہو جاتا تو اسے نہایت آسانی سے ختم کر دیا جاتا اور اس کی جگہ ایک نئی لونڈی بھرتی کر لی جاتی تاکہ تعداد پوری رہے۔ لونڈیوں کو ختم کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ لونڈی کو ایک لمبی

میں بند کر دیا جاتا اور اس بوری کو پہاڑی کی چٹان سے نیچے دھکیل دیا جاتا۔ لیکن بے "رحمدل" بھی واقع ہوا تھا۔ اس مقصد کے لئے بوری میں، اس لونڈی کے ساتھ ایک جنگلی بلی بند کر دی جاتی۔ جب بوری نیچے لڑھکتی تو بلی پریشان ہو کر لونڈی کو نوچنا شروع کر دیتی۔ اس سے اس لونڈی کی توجہ آنے والی موت کے خیال سے ہٹ کر، بلی کے نوچنے کی طرف منتقل ہو جاتی اور اس طرح وہ موت سے بے خبر ہو کر ہلاک ہو جاتی۔

کہئیے! ہے ناں جدت!!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان عورتوں کو معلوم تھا کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے، تو ان میں سے کوئی منچلی موقع پا کر بے کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتی تھی؟ بے کو اس کا احساس تھا اس لئے اس نے اس کے لئے خاطر خواہ بندوبست کر رکھا تھا۔ اول تو یہ کہ جب کوئی لونڈی اس کے پاس تخلیہ میں آتی تو وہ بالکل برہنہ ہوتی۔ اور پھر خلوت کے وقت اس کے ہاتھ پیچھے پیچھے باندھ دیئے جاتے۔

جب فرانسیسیوں نے اس بے کو جلا وطن کیا ہے تو (سال گذشتہ کی خبروں کے مطابق) ان میں سے تقریباً چالیس لونڈیاں اس کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ باقیماندہ کو فرانسیسی گورنر نے دریاں سینے کا کام دیا لیکن وہ سینا پرونا جانتی ہی نہ تھیں۔ اس پر اس نے ان سب کو مقامی مفتی صاحب کے پاس بھیجدیا۔ مفتی صاحب نے ان کے زیورات تو خود سنبھال لئے اور انہیں بذریعہ نیلام فروخت کر دیا۔

یہ تو تھی دُور کی بات۔ اب ذرا اپنے گھر کے قریب آیئے۔ اخبار ڈان (بابت ۲۰ اپریل) میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ شہزادہ برار (حضور نظام دکن کے صاحبزادہ والا تبار) قرضے کے بوجھ اور باپ کی تلقین سے اس پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے "حرم" کو ختم کر دیں جو ساٹھ لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ جن لڑکیوں نے از خود جانے سے انکار کر دیا، شاہزادہ صاحب نے ان کے مکانات سے بجلی منقطع کر دی اور ان کا راشن بند کر دیا تاکہ وہ اس طرح مجبور ہو کر نکل بھاگیں۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جن کا دعوٰے ہے کہ انہیں محل میں رہنے کا حق حاصل ہے۔ ان کے اس دعوے پر غور ہو رہا ہے۔

سن لیا آپ نے؛ یہ ان حضرات کے حالات ہیں جن کے نام خطبوں میں دعا اور سلام کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ اور جنہیں ظل اللہ علی الارض کہا جاتا ہے!

اور اس پر بھی مسلمان تحقیقاتی کمیٹیاں بٹھلاتے ہیں کہ وہ غور کریں کہ دنیا میں ذلیل کیوں سمجھی جاتی ہے؟ لیکن دنیا جو کچھ سمجھتی ہے سمجھا کرے۔ جب ہمارے علمائے کرام کے فتوے کی رُو سے اسلام میں بے تعداد لونڈیاں جائز ہیں اور انہیں استعمال کے بعد فروخت بھی کیا جا سکتا ہے، تو پھر کس کی مجال ہے کہ ان باتوں پر چیں بجبیں ہو؟ ایسا کرنے والا "منکر حدیث" اور "منکر شان رسالت" ہے یا عجب واحسرتا!!

طالب علموں کی تباہیاں

ہمارے ہاں تعلیم کا جو حشر ہو رہا ہے اور طالب علموں کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کو تباہ کرنے کے لئے جو جو عناصر کار فرما ہیں، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ارباب

حل و عقد کی نگاہوں میں وہ اسباب و عناصر طالب علموں کی بربادی کے لئے کافی نہیں تھے۔ اس لئے انہیں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مزید عناصر تلاش کرنا پڑے۔ یہ دو تین مہینے طالب علموں کے لئے خاص طور پر محنت کرنے کے ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بعد ان کے سالانہ امتحانات آجاتے ہیں۔ ان دنوں اُن کی توجہ صرف پڑھائی پر مرکوز رہنی چاہیئے۔ ان کے لئے کوئی اور کشش ایسی نہیں ہونی چاہیئے جو ان کے ذہن کو دوسری طرف لے جائے۔ لیکن عین انہی دنوں ہمارے ہاں ملک میں کرکٹ کے ٹسٹ میچوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے جو مارچ تک برابر جاری رہے گا۔ ایک ایک میچ چار چار پانچ پانچ دن تک چلتا ہے۔ جس شہر میں میچ ہو وہاں کے طالب علموں کے لئے تو ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری طرف دھیان دے سکیں۔ لیکن دوسرے شہر والے بھی اس متعدی وبا سے محفوظ نہیں رہتے۔ ان کے لئے ریڈیو کی کومنٹری بھی کچھ کر دیتی ہے۔ صبح سے شام تک طالب علم کاپیاں لئے ریڈیو کے گرد جمع رہتے اور میچ کی تفاصیل کاپیوں میں لکھتے رہتے ہیں۔ میچ کے بعد دن بھر کی کارروائی پر تبصرے اور تنقیدیں ہوتی ہیں۔ رات کا تھوڑا سا وقت فرصت کا مل سکتا تھا لیکن اربابِ بست و کشاد کی عنایت سے اس کے لئے بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ عین انہی دنوں کراچی ریڈیو نے اپنے ہاں "ڈراما ڈیک" سنانا شروع کر دیا ہے۔ یعنی ہر شب ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک۔ ایک نیا ڈراما نشر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ طالب علموں نے کھانا کھایا اور پھر ریڈیو کے گرد جمع ہو گئے۔ دس بجے رات تک ڈراما سنا۔ پھر دن بھر کے تھکے ماندے پڑ کر سو رہے۔

حیرت ہے کہ سارے ملک میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں جو ان لوگوں کو ٹوکے کہ تم نے قوم کے بچوں کو اس طرح تباہ کرنے کی کیوں ٹھان رکھی ہے؟

"پاکستان زندہ باد" کہنے والو سوچو کہ اگر ہماری آنے والی نسلیں اس طرح "مردہ باد" ہو گئیں تو پاکستان کس طرح زندہ رہ سکے گا؟

اسبابِ زوالِ امت

از پرویز

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟
ایک سو اڑتالیس صفحات ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

مجلسِ اقبال

بابِ ہفتم

اس باب کا مضمون یہ ہے کہ یونانی فلاسفر افلاطون، جس کے افکار و تخیلات سے اسلامی ادب اور تصوف بے حد متاثر ہے، مسلکِ گوسفندی کا پیرو تھا۔ اس کے فلسفہ و تخیلات سے احتراز لازم ہے۔

سابقہ عنوان میں علامہ اقبالؒ بتا چکے ہیں کہ ہر ایسا فلسفہ یا تصورِ حیات جس سے نفیِ 'خودی' کا سبق ملتا ہو مسلکِ گوسفندی ہے۔ یعنی ایسا مسلک ہے جسے محکوم اور کمزور اقوام اس لئے وضع کرتی ہیں کہ اس کے ذریعے طاقتور اور صاحبِ اقتدار قوم کو ضعیف و ناتواں بنا دیا جائے۔ زیرِ نظر باب میں وہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ اس مسلکِ گوسفندی کا اولیں موجد، یونانی فلاسفر افلاطون تھا۔ افلاطون کے فلسفہ کے متعلق اس ضمن میں گفتگو کرنا مشکل ہے۔ وہ بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ لیکن اس کے جس بنیادی تصور کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ (اس کے نزدیک) یہ کائنات اور اس میں جو کچھ موجود ہے، فی الحقیقت موجود نہیں ہے۔ حقیقی وجود ایک اور دنیا کا ہے جسے عالمِ امثال، کہتے ہیں۔ وہاں ہر شے فی الحقیقت موجود ہے اور اس دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ ان حقیقی اشیاء کا سایہ ہے۔ اس دنیا کی اشیاء کو وہ اعیان نامشہود کہتا ہے۔ یعنی (INVISIBLE IDEAS) لہٰذا حقیقی وجود صرف تصورات (IDEAS) کا ہے۔ محسوس دنیا (WORLD OF CONCRETE) کا نہیں۔ دنیائے محسوسات صرف فریبِ نظر یا حلقۂ دامِ خیال ہے۔ بنا بریں، جو علم حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) وہ بھی فریب ہے۔

اعیانِ نامشہود یا حقیقی دنیا کا علم، باطن کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ تصورِ حیات، سہل انگاری اور فقدانِ عمل کو حسن کارانہ جوہر (VIRTUE) بنا کر دکھاتا تھا اس لئے دنیا کی ہر کمزور قوم نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہودیت میں تصوف اس کے راستے آیا۔ عیسائیت تو گویا اسی کا چربہ ہے۔ بدھ مت بھی اس سے متاثر ہوا۔ ایران میں مجوسیت نے اسے اپنایا۔ ہندوؤں کے ویدانت بھی اسی کا عکس ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ تصور ساری دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ نبی اکرمؐ تشریف لائے اور انہوں نے زلزلہ انگیز اعلان اور انقلاب آفریں پیغام سے اس فسونی طلسم کا

تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔ قرآن نے واضح الفاظ میں پکار کر کہدیا کہ خلق السمٰوٰت والارض بالحق۔ خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ یہ حقیقی (REAL) ہے۔ جو اسے باطل (UN - REAL) کہتا ہے وہ حقائق سے انکار کرتا ہے اس کا یہ دعویٰ علم پر مبنی نہیں۔ محض قیاسی اور ظنی ہے۔ وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلاً۔ ذٰلک ظن الذین کفروا۔ ایسے تصورِ حیات اور فلسفۂ زندگی کا مآل بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ فویل للذین کفروا من النار (۳۸/۲۷) اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور انسان سے کہدیا ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کرکے اشیائے کائنات کو اپنے مصرف میں لائے۔ قوانین کائنات کا یہ علم حسی شہادات کی رو سے ہوگا۔ اس لئے قرآن کی رو سے علم بذریعہ حواس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ اس نے علم کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ اس کی شہادت انسان کی سماعت، و بصارت اور ذہن دے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کے تیشۂ ابراہیمیؑ نے کس طرح بتخانہ افلاطونی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی؟ سوچئے کہ دنیائے فکر و عمل پر یہ قرآن کا یہ کتنا بڑا احسان تھا؟

لیکن زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ خود قرآن کی حامل قوم (مسلمانوں) نے بھی وہی مسلکِ افلاطونی اختیار کر لیا جسے قرآن نے اس بُری طرح سے پامال کیا تھا۔ غور کیجئے کہ اس سے بڑی بدبختی بھی کسی قوم کی ہو سکتی ہے؟ وہ دن اور آج کا دن۔ افلاطونی طلسم، مقدس تصوف کی شکل میں، مسلمانوں کے قلب و دماغ کو مسحور کئے ہے، اور اس حد تک مسحور کہ یہ قوم اسے نہ صرف دین کے مطابق سمجھتی ہے بلکہ اسے اصلِ اسلام اور مغزِ دین قرار دے رہی ہے۔ اور جو شخص اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت کرتا ہے ساری قوم اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جن کی نگاہیں اس افلاطونی طلسم کو بھانپ بھی لیتی ہیں وہ بھی کھلے بندوں اس کی تردید نہیں کرتے بلکہ "عجمی تصوف" اور "اسلامی تصوف" کی اصطلاحات کے پردے میں بین بین چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ جب علامہ اقبال کے الفاظ میں "تصوف اسلام کی سرزمین میں سے ہی ایک اجنبی پودا" تو پھر "اسلامی تصوف" اور "عجمی تصوف" کی تفریق ہی غلط اور بے معنی ہے؛ جس تصور پر تصوف کی بنیاد ہے جب وہ تصور ہی خلافِ قرآن ہے تو اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت کس طرح اسلامی ہو سکتی ہے؟

اس تمہید کے بعد اب مثنوی کے متعلقہ اشعار کی طرف آئیے۔ پہلا شعر ہے۔

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم

یہاں افلاطون کو راہب کہا گیا ہے ظاہر ہے کہ راہب سے مراد وہی نہیں جو بستی کو چھوڑ کر جنگل میں چلا جائے۔ راہب وہ بھی ہے جو اس تصورِ حیات کو صحیح سمجھے کہ دنیا کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور اس سے جس قدر دُور بھاگا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اس بنا پر آپ دیکھئے کہ ہماری "طریقت" تو ایک طرف ہماری موجودہ شریعت بھی (جو رسول اللہ کی پیش فرمودہ شریعت سے مختلف ہے) کس قدر افلاطونی رہبانیت سے متاثر ہے۔ اس شریعت کی رو سے دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ یا دنیا ایک جیل خانہ ہے جس میں مومن قیدی کی طرح رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ افلاطونی طلسم ہمارے فکر و کردار کے کن کن گوشوں تک کو متاثر کر گیا ہے اور اس نے مسلمانوں جیسی شیر نہاد قوم کو کس حد تک مسلکِ گوسفندی کا پیرو بنا دیا ہے؟

اسی افلاطون کے متعلق حضرت علامہ لکھتے ہیں کہ

رخش او در ظلمتِ معقول گم
در بیابانِ وجود افگندہ سُم

اس کا توسنِ فکر، فلسفہ کی تاریک وادیوں میں گم ہے۔ اسے زندگی کی صراطِ مستقیم کی طرف راستہ ہی نہیں مل سکتا۔ اس لئے جب وہ عالمِ موجودات کی طرف آتا ہے تو وہاں پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے آگے چل ہی نہیں سکتا۔

آنچناں افسونِ نامحسوس خورد
اعتبار از دست، چشم و گوش بُرد

اسے تصورات کی دُنیا نے، جو محسوسات کی زد سے ماورا ہے، اس قدر فریب دے دیا کہ اس نے کہہ دیا کہ جو علم حواس (سمع۔ بصر۔ لمس) کے ذریعے حاصل ہو، وہ قابلِ اعتبار ہی نہیں۔ یعنی انسان جو "علم" حجرے کے گوشے میں بیٹھ کر، آنکھیں بند کر کے، تصور ہی تصور میں حاصل کرے، وہ تو یقینی علم ہے لیکن جس چیز کو آنکھ دیکھے جس آواز کو کان سنے۔ جو ٹھوس شے (Concrete Thing) انسان کی گرفت میں آجائے، وہ محض قیاس ہے!! یہ ہیں تصوف کی باطنیت کے کرشمے۔ کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

اس نظریۂ زندگی کو پیش کر کے افلاطون نے کہا کہ

گفت سرِ زندگی، در مردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است

زندگی کا راز، مرجانے میں ہے۔ شمع کی درخشندگی اور تابناکی اس کے بجھ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ "مرنے سے پہلے مرجانا" یہ ہے مقصودِ حیات! دنیا میں بیٹھے ہوئے دنیا سے اُٹھ جانا۔ یہ ہے رازِ زیست۔

یہ افلاطون

بر تخیلہائے ما فرماں رواست
جامِ او خوابِ آور و گیتی ربا است

ہمارے تصوراتِ زندگی اور نظریاتِ حیات پر مسلط ہے۔ اس کے فلسفہ کا جام شراب (تصوف) ایسا یخ بستہ ہے کہ انسان کی رگوں میں دوڑنے والے خونِ گرم کو منجمد کر دیتا ہے۔ اس کے قلب و دماغ پر نیند غالب آجاتی ہے۔ وہ جاگتا ہوا بھی سوتا ہے۔ وہ جیتے جی مردہ ہو جاتا ہے

یہ افلاطون

گوسفندے در لباسِ آدم است — حکم او بر جانِ صوفی محکم است

انسان نہیں، بلکہ انسان کے لباس میں وہی بھیڑ ہے جس کا قصہ سابقہ عنوان میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اور ہمارا صوفی اس افلاطون کے حکم کے تابع چلتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

عقلِ خود را بر سرِ گردوں رساند
عالمِ اسباب را افسانہ خواند

یہ صوفی اس دنیا کے متعلق کہتا ہے کہ یہ محض افسانہ ہی افسانہ ہے۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل دحقیقت، آسمانوں سے اوپر عالمِ امثال کی ہے۔ اس لئے وہی دنیا اس قابل ہے کہ اس پر غور و فکر کیا جائے۔

کار او تحلیلِ اجزائے حیات
قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات

وہ دن رات اسی فکر میں رہتا ہے کہ جن جن عناصر سے مل کر زندگی بنتی ہے انہیں گھلا گھلا کر ختم کر دیا جائے۔ جن جن اسباب سے قوت حرارت اور حیات پیدا ہوتی ہے، انہیں ایک ایک کر کے فنا کر دیا جائے۔ ہر وہ راستہ جس سے زندگی کی نمو ہوتی ہے، بند کر دیا جائے۔ اور اس طرح زندگی کے سرسبز و شاداب شجرِ طوبیٰ کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔ وہ ساری عمر اسی تخریب میں لگا رہتا ہے اور اسے بہت بڑا جہاد سمجھتا ہے۔ یہ ہے فکرِ افلاطونی کا اثر

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نابود گفت

وہ فکر (فلسفہ) جو ہر اس شے کو جس سے زندگی کو نقصان پہنچے، مفید اور نفع رساں قرار دیتا ہے۔ اس کا سبق یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے اسے موہومات سمجھو ——— ہر چند کہیں کہ ہے — نہیں ہے۔

فطرتش خوابید و خوابے آفرید
چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید

افلاطون کی اپنی فطرت خواب آلود تھی اس لئے اس نے ایسا فلسفہ ایجاد کر دیا جس کی رو سے ساری کائنات حقیقت کی بجائے خواب بن کر دکھائی دینے لگی۔ وہ ایسا مدہوش تھا کہ اس کی چشمِ ہوش نے ساری دنیا کو سراب قرار دے دیا اور جو اس کے فلسفہ سے متاثر ہوا اسے بھی سب کچھ سچ مچ سراب نظر آنے لگ گیا۔

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود
جانِ او وارفتۂ معدوم بود

چونکہ وہ خود راحت طلب اور ذوقِ عمل سے محروم تھا اس لئے وہ موجودات سے بیزار ہو کر، اس تصوراتی دنیا کا شیدائی بن گیا جس کا کہیں وجود ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کا مسلک اختیار ہی وہ قومیں کرتی ہیں جن میں جوششِ کردار اور ولولۂ عمل باقی نہیں رہتا۔ اس وقت بجائے اس کے

کہ وہ اپنی اس بے عملی اور خود فراموشی پر نادم ہوں، ان کا نفس فریب کار انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا ہے کہ اصل مقصودِ حیات، عالمِ بالا کے مسائل کا حل کرنا ہے۔ یہ دنیا اور اس کے معاملات اس قابل ہی نہیں کہ انسان ان میں اپنا سر کھپائے۔ چنانچہ یہی وہ فریب تھا جس میں افلاطون مبتلا ہوا۔ اور چونکہ دماغ بڑا منطقی پایا تھا، اس نے اس فریب کو فلسفہ بنا کر پیش کر دیا۔ آپ نے غور کیا کہ ایک اچھے دماغ کا انسان جب غلط راستے پر پڑ جاتا ہے، وہ اپنے ساتھ کتنی اور مخلوق کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ اس اڑھائی ہزار سال کے عرصہ میں کتنی قومیں ہیں جو اس افلاطونی تصوف کے زہر سے ہلاک ہوئیں، اور ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ افلاطون کی اپنی فطرت ذوقِ عمل سے بیگانہ تھی اس کی وجہ سے وہ

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

وہ عالمِ موجودات اور اس کی تمام ہنگامہ خیزیوں سے منہ موڑ بیٹھا۔ اس نے اس کی موجودگی ہی سے انکار کر دیا۔ اور کہہ دیا ہے کہ حقیقی کائنات ان تصورات و امثال کی دنیا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است
مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است

جو شخص اپنے تن میں جان زندہ رکھتا ہے، اس کی نگاہوں میں یہ دنیائے محسوسات بڑی خوش آیند ہوتی ہے۔ تصورات کی موہوم دنیا کو وہی پسند کر سکتا ہے جس کے سینے میں دل مر چکا ہو۔ ایسے شخص کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام
لذتِ رفتار بر کبکش حرام

اس کے آہو کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ جنگل میں بے باک دوڑنے اور کلیلیں بھرنے میں کیا لذت ہوتی ہے۔ اس کا کبک جانتا ہی نہیں کہ رفتار کی لذت کیا ہوتی ہے۔ حالانکہ آہو کہتے ہی اسے ہیں جو سبک خرام ہو اور کبک کی خصوصیت ہی یہ ہے، کہ وہ ناچتا ہوا چلے لیکن خرام و رفتار تو زندگی کی نمود کا نام ہے۔ مردہ انسان کو ان سے کیا واسطہ! اس کی تو حالت یہ ہوتی ہے کہ

شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب

اس کی شبنم میں وہ طاقتِ پرواز ہی نہیں ہوتی جس سے وہ ایک جست میں خورشید عالمتاب سے ہم آغوش ہو جائے۔ اس کے پرندے کے سینہ میں وہ دم ہی نہیں ہوتا جس سے وہ فضا کی پہنائیوں میں بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے۔

ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش
از تپیدن بے خبر پروانہ اش

اس کے دانہ کی شکل و صورت تو دانہ ہی کی ہوتی ہے لیکن اس میں اُگنے، بڑھنے، پھولنے اور پھلنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ وہ کرم خوردہ دانہ

جوہرِ موت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا پروانہ بظاہر چنگا نظر آتا ہے لیکن اس کے سینے میں وہ حرارت ہی نہیں ہوتی جس سے وہ جوشِ مستی میں محوِ رقص رہتا اور خطرے کی ہر آگ میں بے خوف کود پڑتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ

راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت
طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت

چونکہ ہمارے صوفی میں ہنگامۂ کائنات کے سامنے آنے کی ہمت ہی نہ تھی اس لئے اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ کشاکشِ حیات سے فرار کی راہ اختیار کر لیتا۔

عشقِ نبردپیشہ طلبگارِ مرد تھا

زندگی اور اس کے ہنگامے، جرأت اور بلند حوصلگی کے متقاضی ہوتے ہیں۔ جو لوگ جرأت سے عاری اور مردانگی سے بیگانہ ہوتے ہیں وہ ان ہنگاموں سے منہ موڑ کر بھاگ اٹھتے ہیں اور اس کا نام رکھتے ہیں "روحانیت"۔

زاہد نداشت تابِ جمالِ پری رخاں
کنجے گرفت و ترسِ خدا را بہانہ ساخت

قرآن، حقائق کا سامنا کرنے کی تلقین کرتا ہے وہ "لقاءِ رب" کا حکم دیتا ہے۔ لیکن تصوف نام ہی فرار (ESCAPISM) کا ہے لہٰذا صوفی کرتا یہ ہے کہ

دل بسوزِ شعلۂ افسردہ بست
نقشِ آں دنیائے افیوں خوردہ بست

وہ بجھے ہوئے شعلوں کی راکھ سے اپنا دل لگا لیتا ہے اور اس کا نام "عشق کی آگ" رکھتا ہے۔ وہ اس جیتی جاگتی دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے اور اپنے ذہن میں اس موہوم دنیا کے نقشے جمانے شروع کر دیتا ہے جو افیونیوں کے عالمِ خیال کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔

از نشیمن سوئے گردوں پر کشود
باز سوئے آشیاں نامد فرود

آپ غور کیجئے کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ پرندے کی زندگی یہ ہے کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ
نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

وہ فضا کی بیکراں پہنائیوں میں دن بھر اڑتا رہتا ہے، لیکن اپنے آشیانہ کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتا ہے اور شام کے وقت، سفر سے فارغ ہونے کے بعد، پھر اپنے نشیمن کی طرف آ جاتا ہے۔ مسلمان کے سامنے زندگی کا بلند نصب العین تھا۔ اس کا فریضۂ حیات یہ تھا کہ وہ ساری دنیا میں تگ و تاز کرے لیکن اپنے نصب العین حیات کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ اس کا ہر قدم اس نصب العین

کی طرف لپٹے اور اس کی ہر حرکت کا رُخ اسی کی سمت رہے۔ اور اس طرح وہ "انا الیہ راجعون" کی عملی تفسیر بن جائے۔ لیکن جب اس نے قرآن کو چھوڑ کر تصوف اختیار کر لیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فضا کی پہنائیوں میں ایسا گم ہوا کہ پھر نشیمن کی طرف لوٹنا نصیب ہی نہ ہوا۔ یہ مابعد الطبیعاتی مسائل کے سلجھانے میں ایسا اُلجھا کہ دنیائے محسوسات خواب و خیال ہو گئی۔ یہ "آسمانی حقائق" کی کشود میں ایسا پھنسا کہ اس کی ساری زمین غیروں کے قبضے میں چلی گئی۔ یہ "شاعری" کے افسانوں میں ایسا کھویا کہ زندگی کی ساری حقیقتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔

یہ ہے افلاطونی تصوف کا اثر۔ اُس کی حالت یوں سمجھئے کہ

در خُمِ گردوں خیالِ اُو گم است
من ندانم دُرد یا خشتِ خم است

اس کا خیال، آسمانی شراب کے مٹکے میں گم ہے۔ لیکن جسے وہ شراب سمجھے بیٹھا تھا وہ شراب تھی ہی نہیں۔ وہ تلچھٹ تھی یا وہ ٹھیکری جو مٹکے کے نیچے رکھی جاتی ہے، یا منہ پر ڈھکنے کے لئے دی جاتی ہے۔ یعنی بےکار اور بےمعنی شے۔ لیکن وہ اپنے تصورات کی دنیا میں اس قدر گم تھا کہ اسے حقیقت نظر ہی نہیں آتی تھی۔

یہ تھا افلاطون کہ ۔۔

قومہا از سُکرِ اُو مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

قوموں کی قومیں اس کے افیونی نشہ سے زہر آلود ہو گئیں۔ اس سے ان کے قویٰ اور اعصاب پر نیند کی افسردگی چھا گئی۔ اور وہ ذوقِ عمل سے بیگانہ ہو گئیں۔ یہ ہے جو کچھ افلاطون نے دنیائے انسانیت کے ساتھ کیا۔ اور یہ ہے اس تصوف کی حقیقت اور اصلیت جسے ہمارے ہاں "مغزِ دین" قرار دیا جاتا ہے ظلمٰت بعضھا فوق بعض۔ تاریکیاں اور تو بر تو تاریکیاں!

(اسی شعر پر یہ باب ختم ہو جاتا ہے)

اقبال و قرآن

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ــــــــــــــــ قیمت دو روپے

ادارۂ طلوع اسلام پوسٹ بکس ۱۳۱ ۔ کراچی

اسلام کی سرگذشت

[علامہ احمد امین مصری کی شہرۂ آفاق کتاب "فجر الاسلام" کا ترجمہ ہفتہ وار طلوع اسلام میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے ناظرین کا اصرار ہے کہ اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے اس لئے ماہنامہ طلوع اسلام میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

گذشتہ اقساط میں۔ جزیرۂ عرب، اس کا محل وقوع، اجزاء، آب ہوا، باشندے، انساب، اور حالت اجتماعیۂ دیگر اقوام کے ساتھ عربوں کے تعلقات، وسائل تعلق، سرحدوں پر عربی مملکتوں کا قیام، عربی مملکتوں کی طبیعت عقلیہ، حیات عقلیہ کے مظاہر، اسلام، اسلامی تعلیمات کا عربوں پر اثر، جاہلی زمانہ میں ایک عرب کی مثالی زندگی اور اسلام کے عہد میں مثالی زندگی کا موازنہ، جاہلی اور عربی اثرات کے تصادم وغیرہ مباحث سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ آئندہ صفحات میں، فتوحات اسلامی کے بعد بین الاقوامی امتزاج و اختلاط سے بحث کی جائے گی۔] [طلوع اسلام]

(فصل دوم)

اسلامی فتوحات اور بین الاقوامی اختلاط کا اثر

اسلامی فتوحات پر توقفیل کے ساتھ ہم اس حصہ میں بحث کریں گے جو اسلام کی سیاسی زندگی سے متعلق ہوگا۔ یہاں ہمیں اسلامی فتوحات پر محض اس زاویہ سے نظر ڈالنی ہے کہ اس کا مسلمانوں کی عقلی اور دینی زندگی سے کہاں تک تعلق تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ ان فتوحات نے مسلمانوں کے علم اور دین پر براہ راست اور بالواسطہ کیا کیا اثرات مرتب کئے۔

رسول اللہ صلعم کی وفات ہوئی تو اسلام کا دائرۂ اثر جزیرۂ عرب تک ہی محدود تھا۔ البتہ ہمسایہ اقوام کو اسلام کی دعوت دی جا چکی تھی اور ان کے ساتھ چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد پے در پے فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عراق فتح ہوا جہاں کچھ عربی قبائل یعنی ربیعہ اور مضر کی شاخیں اور کچھ ایرانی آباد تھے ـــــ یہ آبادیاں ان شہروں کی اصلی آبادی سے الگ تھیں ـــــ ان میں سے کچھ نصرانی تھے، کچھ مزدکی اور زرتشتی۔ عربوں نے آکر یہاں دو نئے شہر، بصرہ اور کوفہ، آباد کئے۔ حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ مدائن اور قادسیہ کی آب و ہوا عربوں کے مزاج سے سازگار نہیں تو انہوں نے حکم دیا کہ کوئی ایسا مقام تلاش کیا جائے جو جزیرۂ عرب سے متصل ہو اور درمیان میں کوئی سمندر یا ریگستان نہ پڑتا ہو۔ حضرت عمرؓ کا منشاء یہ تھا کہ ایسی دو چھاؤنیاں قائم

کر دی جائیں جہاں عربوں کو صحرائی ہوا میں میسر آسکیں اور اس کے ساتھ ہی وہ مدنیت کے نقائص اور عیوب سے محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ ۱۴ھ کے لگ بھگ بصرہ اور ۱۷ھ (۶۳۸ء) کے لگ بھگ کوفہ آباد کر لیا گیا۔

ایران فتح ہوا تو وہاں ایرانی اور کچھ یہودی اور تھوڑے سے رومی لوگ جو ایران اور روم کی باہمی جنگوں میں گرفتار ہو کر آئے تھے، آباد تھے۔

شام فتح ہوا — وہ قدیم زمانہ سے — مختلف قوموں اور مختلف تہذیبوں کی جولانگاہ بنا چلا آرہا تھا۔ فینقی، اموری، کنعانی، فراعنۂ مصر، یونانی، رومی اور غسانی عرب یکے بعد دیگرے سب قومیں ہی اس پر حکمرانی کر چکی تھیں۔ آخر میں یہ رومی سلطنت کا ایک حصہ تھا جو رومی تہذیب کے رنگ میں بخوبی رنگا جا چکا تھا حتیٰ کہ اس نے ان کا مذہب یعنی نصرانیت کو بھی اپنا لیا تھا۔ اسلام نے شام کو فتح کیا تو اسے وہاں اقوام سابقہ کی تہذیبوں میں سے بہت سی باتیں ورثہ میں ملیں۔

اسلام نے شام کو فتح کیا تو وہاں شامی قوم — جو یہاں کے اصلی باشندے تھے — ارمن، یہودی اور کچھ رومی لوگ اور چند عربی قبائل آباد تھے۔ عربی قبائل میں سے زیادہ تر غسانی، لخمی جذامی، کلبی، قضاعی اور کچھ تغلبی لوگ آباد تھے، ان لوگوں کی آبادیاں شمالی حصہ کے بہ نسبت جنوبی حصہ میں زیادہ تھیں۔ کیونکہ یہ حصہ جزیرۂ عرب سے قریب تر تھا۔ یہ عربی قبائل جو زبان بولتے تھے وہ آرامی اور عربی زبان کا مخلوط مجموعہ تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو شامی سمجھتے تھے۔ عربوں کے ساتھ ان کے روابط محض تجارتی قسم کے تھے۔ اسلامی فتوحات کے وقت بھی یہ لوگ مسلمانوں کے مقابلہ میں رومی فوجوں کے دست و بازو بنے رہے[1]۔

مصر فتح ہوا تو وہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ، قدیم مصری تہذیب اور یونانی و رومی تہذیبوں کا وارث تھا۔ یہیں اسکندریہ تھا جو فلسفی مذاہب اور دینی جماعتوں کا سنگم اور مشرقی و مغربی افکار و آراء کا نقطۂ اتصال تھا۔ یہاں مصری اور کچھ دوسری قوموں شلاً یہودی اور رومی — کے مخلوط لوگ آباد تھے۔ اس کے بعد بلادِ مغرب مثلاً برقہ، طرابلس، الجزائر، مراکش اور جبل الطارق تک اسلامی فتوحات میں شامل ہوتے چلے گئے۔ یہ تمام علاقے رومیوں کے قبضہ میں تھے۔

ولید بن عبدالملک کے عہد میں سندھ، بخارا، خوارزم، سمرقند اور کاشغر تک فتح ہوئے۔ نیز اندلس بھی فتح ہوا۔ مگر ان فتوحات کے اثرات اس عرصہ میں نمایاں نہیں تھے جس سے ہم یہاں بحث کر رہے ہیں۔

عربوں کا ان ممالک کو فتح کر لینا فاتح قوم اور مفتوح اقوام کے درمیان ایک قوی اختلاط و امتزاج کا ذریعہ بن گیا۔ خون میں اختلاط، نظم اجتماعی میں اختلاط، عقلی آراء میں اختلاط اور دینی عقائد میں اختلاط۔ ہر چیز میں اختلاط پیدا ہوتا چلا گیا۔ اس اختلاط و امتزاج پر ساری باتیں ہی اثر انداز ہوئیں۔ تاہم اہم ترین باتیں یہ تھیں۔

(۱) فتوحات کے بارہ میں اسلامی تعلیمات۔

(۲) مفتوحہ ممالک کی آبادی کا زیادہ تر اسلام میں داخل ہو جانا۔

(۳) شہری سکونت میں عربوں اور غیر عربوں کا اختلاط کے ساتھ رہنا سہنا۔ مختصر طور پر ہم ان تینوں اہم ترین اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔

اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ مسلمان جب کسی شہر کو

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ در مادۂ "شام"۔

فتوحات کے بارہ میں اسلامی تعلیمات

فتح کرنا چاہیں تو ان پر ابتداءً یہ واجب ہے کہ وہ اہل شہر کو اسلام میں داخل ہو جانے کی دعوت دیں۔ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو وہ اور سارے مسلمان برابر ہو جاتے ہیں[۸]۔ حدیث میں ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ کروں جب تک وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه نہ کہیں۔ لیکن جب وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہہ لیں تو ان کے خون اور اموال میری طرف سے محفوظ ہو جائیں گے۔ بجز اس حق کے جس کا تقاضہ خود اس کلمہ کا اقرار کرتا ہو۔ باقی ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔" اگر وہ لوگ اسلام میں داخل نہ ہوں تو دوسرا مطالبہ ان سے یہ کیا جائے گا کہ وہ شہروں کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیں کہ وہاں وہ اپنی حکومت قائم کر دیں، اور ان شہروں کے باشندے ـــــ اگر وہ چاہیں تو ـــــ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں۔ البتہ ان لوگوں کو جزیہ دینا ہوگا[۹]۔ چنانچہ اگر وہ اسے قبول کر لیں تو ان کے وہی حقوق ہوتے ہیں جو خود مسلمانوں کے حقوق ہوتے ہیں۔ اور وہی واجبات ہوتے ہیں جو خود مسلمانوں کے واجبات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کی حفاظت میں ہوتے ہیں وہ ان کی حفاظت کریں گے اور دشمنوں سے اُن کی مدافعت کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو اَھْلُ الذِّمَّة کہا جاتا تھا[۱۰]۔ اگر وہ نہ اسلام قبول کریں اور نہ اسلامی حکومت کے تحت رہنا اور جزیہ دینا قبول کریں تو پھر ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے گا اور اُن سے جنگ کی جائے گی۔ دورانِ جنگ میں مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ وہ جنگ کرنے والوں کو اور ان لوگوں کو جو ان کی مدد کر رہے ہوں قتل کر دیں۔ لیکن عورتوں، بچوں، بوڑھوں، اندھوں، معذوروں، وغیرہ کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ اس جنگ میں مؤثر رائے نہ رکھتے ہوں اور مسلمانوں

---

[۷] فٹ نوٹ نمبر دوسرے کالم میں دیکھئے۔

[۸] قرآن کی رُو سے جنگ کن صورتوں میں جائز ہے۔ جن کے ساتھ جنگ کی جائیگی۔ اُن کے سامنے کیا کیا شرائط پیش کی جا سکیں گی۔ صلح کس طرح ہو گی۔ جزیہ کن حالات میں لیا جائے گا۔ یہ وہ امور ہیں جن کے متعلق تفصیل سے بیان کیا جانا ضروری تھا۔ افسوس ہے کہ مصنف نے ایسا نہیں کیا جس سے بعض غلط فہمیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ چونکہ یہ موضوع تفصیل طلب ہے، اس لئے ہم بھی حاشیہ میں بیان نہیں کر سکتے۔ انشاءاللہ اس موضوع پر کبھی طلوع اسلام میں تفصیلاً لکھا جائیگا۔ [طلوع اسلام]

[۹] جزیہ وہ ٹیکس ہے جو افراد پر لگایا جاتا ہے۔ عرب بت پرستوں کے علاوہ نصاریٰ، یہود، مجوس، اور صابئہ جزیہ دے سکتے ہیں۔ یہ ٹیکس صرف مردوں پر عائد کیا جاتا ہے۔ عورتوں، بچوں اور کمزوروں پر عائد نہیں کیا جاتا۔ یہ نقد بھی دیا جا سکتا ہے اور سامان (مثلاً کپڑے وغیرہ) کی صورت میں بھی۔ عموماً ہر شخص سے ایک دینار سالانہ یا تیرہ درہم سالانہ لئے جاتے تھے۔ بعد میں یہ کم از کم حد ہو گئی تھی درمیانی دو دینار یا چوبیس درہم اور مالداروں سے چار دینار لئے جاتے تھے۔ اگر کوئی شخص یہ ٹیکس ادا نہیں کرتا تھا تو اسے قید کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جو ٹیکس زمین پر ہوتا تھا اسے خراج کہتے تھے۔

[۱۰] عرب بت پرستوں اور اسلام سے مرتد ہو جانے والوں کے علاوہ دوسری قومیں اہلِ ذمہ بن سکتی ہیں۔ عرب بت پرستوں اور اسلام سے مرتد ہو جانے والوں سے اسلام قبول کیا جا سکتا ہے ورنہ پھر ان سے جنگ کی جائیگی۔ مرتد ہو جانے والوں سے مراد یہاں وہ جماعت ہے جو اسلام سے پھر جائے اور بغاوت کر دے۔

(طلوع اسلام) بغاوت اور شے ہے۔ محض اسلام سے پھر جانا قرآن کی رُو سے کوئی جرم نہیں، جس کی پاداش میں جنگ کی جائے۔

کے خلاف سازشوں میں مشغول نہ ہوں۔ رسول اللہ صلعم نے یوم حنین میں ورید ابن الصمۃ کو قتل فرما دیا تھا۔ حالانکہ وہ بہت بڑھا اور اندھا آدمی تھا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی قوم کو جنگی تدبیریں سمجھایا کرتا تھا۔ اگر دورانِ جنگ میں دشمن کی فوج صلح کی طلبگار ہو تو اگر امیر مناسب سمجھے تو اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ قرآن کریم کا حکم ہے وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا اگر وہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کے لئے جھک جاؤ۔ اور جن شرائط پر صلح ہو جائے ان شرائط کو نافذ کرنا واجب ہوتا ہے اگر صلح نہ ہو سکے اور مسلمان کامیاب ہو جائیں اور شہر کو فتح کر لیں، تو پھر دو قسم کے لوگ ہوں گے ایک تو اسیرانِ جنگ ہوں گے اور دوسرے مفتوحہ شہر کے وہ باشندے ہوں گے جو جنگ آزما فوج کا حصہ نہیں تھے۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق تو قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ یہ حکم ملتا ہے۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡهُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً (حتی کہ جب تم جنگ کا بازار خوب گرم کر چکو تو دشمنوں کو مضبوط باندھ لو۔ پھر اس کے دو ہی راستے ہیں یا انہیں احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیرانِ جنگ کے بارہ میں امام کے لئے دو ہی صورتیں جائز ہیں۔ یا تو وہ ان پر احسان کرے اور انہیں یونہی چھوڑ دے اور یا ان سے فدیہ کے طور پر کچھ مال لے لے۔ یا اس اسیر جنگ کے بدلہ میں کسی مسلمان قیدی کو تبادلہ میں چھڑا لے ......

لیکن دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کبھی کبھی تو ان دونوں صورتوں پر ہی عمل فرماتے تھے۔ اور کبھی قیدیوں کو قتل کر دیتے تھے اور بعض اوقات انہیں لونڈی غلام بنا لیتے تھے۔ چنانچہ جنگ بدر میں رسول اللہ صلعم نے عقبہ ابن ابی معیط کو قتل کرا دیا تھا حالانکہ وہ جنگ میں گرفتار ہو کر آیا تھا۔ ایسے ہی بنو قریظہ کو قتل کرا دیا تھا جبکہ ان لوگوں نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی شرط پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیا تھا۔ مسلمان قیدیوں کے بدلہ میں جو جنگ بدر میں کافروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے بہت سے مشرکین کو آپ نے فدیہ میں بھی دیا تھا۔ ثمامہ ابن اثال حنفی پر آپ نے احسان فرمایا تھا اور اسے یونہی چھوڑ دیا تھا جبکہ وہ آپ کے قبضہ میں گرفتار تھا۔ قریظہ کے بچوں اور عورتوں کو لونڈی اور غلام بنا لیا گیا تھا۔ ہوازن کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا تھا۔

ان تمام باتوں نے مل کر ائمۂ فقہا کو اسیرانِ جنگ کے بارہ میں بڑے ہی اختلاف[۱] اور دشواری میں ڈال دیا ہے۔

مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ امام کو ان چاروں[۲] باتوں کا اختیار ہے۔

---

[۱] اس میں اختلاف اور دشواری کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ قرآنی آیت کے الفاظ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً بالکل واضح ہیں اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے گا وہ غلط ہو گا۔ دوسرے یہ کہ یہ واقعات ہی سرے سے غلط ہیں جو ان روایات میں بیان ہوئے ہیں اور اگر بالفرض وہ صحیح بھی ہیں تو اس آیت کے نزول سے پہلے کے ہیں۔ یہ قطعاً ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی آپ نے کسی اسیر جنگ کو لونڈی یا غلام بنایا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

[۲] مصنف ممدوح کا یہ خیال غلط ہے جو حضرات رسم غلامی کے جواز کے قائل ہیں، وہ شاید اس مغالطہ میں مبتلا ہیں یا دوسروں کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ اسیرانِ جنگ کے بارہ میں دو صورتیں قرآن کریم نے بیان کر دی تھیں اور باقی دو صورتیں رسول اللہ صلعم نے بیان فرما دیں۔ گویا رسول اللہ صلعم نے قرآن کی دو صورتوں پر اپنی طرف سے اضافہ فرما دیا ہے۔ قرآنی حکم کی مخالفت تو نہیں فرمائی اس سے قطع نظر کہ رسول کو احکام الٰہیہ میں حک و اضافہ کا حق ہوتا ہے یا نہیں۔ یہاں غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کے بارہ میں ممکنہ صورتیں صرف چار ہی ہو سکتی تھیں۔

(۱) اسیرانِ جنگ کو قتل کر دیا جائے

(۲) ان کو لونڈی اور غلام بنا کر رکھ لیا جائے۔

(باقی نوٹ صفحہ ۵۶ کالم ۲ پر)

ہر حالت میں احوال وظروف کے مطابق وہ نرمی اور سختی ہر قسم کا عمل کر سکتا ہے۔ اہلِ شام میں سے ایک شخص کا بیان ہے جو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی خلافت پر مامور تھا کہ میں نے حضرت عمرؓ کو کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کسی اسیر جنگ کو قتل کیا ہو۔ البتہ ترکی اسیرانِ جنگ کے ساتھ ایک ترکی اسیر بھی کیا گیا۔ آپ نے ان سب کو غلام بنا لینے کا حکم دے دیا۔ ایک آدمی نے جوان اسیرانِ جنگ کو لیکر آیا تھا عرض کیا کہ اے امیرالمؤمنین! کاش آپ نے اس آدمی کو دیکھا ہوتا ―― اور ایک خاص قیدی کی طرف اشارہ کیا ―― جبکہ وہ مسلمانوں کو بے دریغ تہِ تیغ کر رہا تھا۔ تو آپ بے تحاشا رو پڑے۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات سن کر فرمایا کہ پھر سوچ کیا رہے ہو۔ اٹھو اور اس کی گردن اڑا دو۔ چنانچہ اس آدمی نے کھڑے ہو کر اس کی گردن

فٹ نوٹ ملاحظہ صفحہ کا بقیہ

(۳) ان کو احسان رکھ کر چھوڑ دیا جائے۔

(۴) ان سے فدیہ میں رقم لے کر یا ان کو کسی مسلمان قیدی کے فدیہ میں دے کر چھوڑ دیا جائے۔

پانچویں صورت کہ ان کو کسی کیمپ میں نظر بند کر کے رکھا جائے اس زمانہ میں قابلِ عمل تھی ہی نہیں۔ بہرحال مذکورہ بالا چار صورتوں میں سے قرآن کریم نے حصر کے صیغہ کے ساتھ صرف دو صورتوں کو جائز رکھا ہے جس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ بقیہ دونوں ممکن العمل صورتیں ممنوع ہیں۔

رسول اکرم صلعم کے متعلق یہ کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی نص صریح سے جو دو صورتیں ممنوع ہوں آپ ان پر عمل پیرا ہوں گے۔ اور نہ ہی آپ کے بعد یہ کسی امام کو اختیار دیا جا سکتا ہے یہ قرآنی حکم پر اضافہ نہیں ہے بلکہ صراحتہً اس کی مخالفت کرنا ہے جو نہ رسول کے لئے جائز ہے اور نہ کسی اور امام کے لئے۔ (تفصیل کے لئے ادارہ کی شائع کردہ کتاب "تین اہم مسائل" میں غلام اور لونڈیوں کا عنوان دیکھئے)　　(طلوعِ اسلام)

اڑا دی۔[۱]

مفتوح شہر کے باشندے جو جنگ میں شریک ہوں ان کے متعلق امام کو اختیار ہے چاہے انہیں غلام بنالے اور چاہے انہیں آزاد چھوڑ دے کہ وہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ―― اور اس قسم کے مسائل میں انہی کے اقوال کی طرف عموماً مراجعت کی جاتی ہے ...... سوادِ عراق کے لوگوں کو آزاد ہی چھوڑ دیا تھا اور تمام مالدار لوگوں پر اڑتالیس درہم اور غیر مالدار لوگوں پر چوبیس درہم سالانہ جزیہ مقرر کر دیا تھا

جب اسیرانِ جنگ یا مفتوح شہر کے باشندوں کو غلام بنا لیا جائے تو ان کو مالِ غنیمت کی طرح تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس میں سے خمس یا پانچواں حصہ نکال کر یتامیٰ، مساکین، اور مسافرین کو دیدیا جائے گا۔ اور باقی چار خمس مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ پیادہ کا ایک حصہ ہوگا اور سوار کے دو حصے ہوں گے۔

ان مباحث سے تم نے دیکھ لیا ہے کہ فتوحاتِ اسلامی کے نتیجہ میں غلامی کی رسم آگئی اور یہ غلامی کی رسم ہی تھی جس نے اختلاط وامتزاج کے عمل میں بڑا ہی نمایاں کام کیا اس لئے ضروری ہے کہ اس موضوع پر خصوصیت سے گفتگو کی جائے۔

غلامی، دنیا کا ایک عام رواج تھا۔ اس ضمن میں اقوام عالم میں باہمی اختلاف اتنا ہی تھا کہ کچھ قومیں غلاموں سے بہتر سلوک کرتی تھیں اور کچھ قومیں خراب سلوک کرنے کی عادی تھیں۔ یہودی قوم غلام بناتی تھی۔ مذہب یہودیت غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔ یہودیت نے غلامی کی مدت کو سات سال تک

---

[۱] تفسیر طبری ... [۲] اس بارہ میں المبسوط ... فتح القدیر اور "تاریخ طبری" کا مطالعہ کیجئے۔

محدود کر دیا ہے۔ سات سال کے بعد ہر غلام آزاد ہو جاتا ہے۔ یونانیوں کے ہاں بھی غلامی کا رواج تھا جس کی تفصیل بہت طول طویل ہے۔ رومیوں کے ہاں بھی غلامی موجود تھی۔ رومی قانون نے تو مالک کو یہ حق بھی دیدیا تھا کہ وہ اسے چاہے تو قتل کر سکتا ہے اور چاہے تو زندہ رکھ سکتا ہے رومی قانون نے مالک کو بالکل مستبد بنا دیا تھا۔ اس سے غلام کے ساتھ سلوک کرنے کے بارہ میں کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے مہذب غلاموں کی بہت کثرت ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ بعض مورخین نے بیان کیا ہے کہ روم کی مملکت میں آزاد لوگوں کے مقابلہ میں غلاموں کی تعداد تین گنی ہو گئی تھی۔ عمل اور سلوک کے اعتبار سے غلاموں کی حالت آہستہ آہستہ معتدل ہوتے گئے مگر قانونی طور پر دوسری صدی عیسوی سے اس میں اعتدال آگیا۔

عرب لوگ زمانۂ جاہلیت میں آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے اور فریق مخالف کے مردوں اور عورتوں پر غالب آجانے کے بعد ان کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا کرتے تھے۔ چند بازار تھے جہاں یہ غلام اور لونڈیاں فروخت کئے جاتے تھے "اسد الغابہ" میں ہے کہ حضرت زید ابن حارثہ جو رسول اللہ صلعم کے آزاد فرمودہ غلام تھے قبیلۂ قضاعہ میں سے تھے اور ان کی والدہ قبیلہ طے میں سے تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ گرفتار ہو گئے۔ ان کی والدہ اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے اپنے میکہ (خاندان بنو معن کے پاس) جا رہی تھیں۔ راستہ میں اس چھوٹے سے قافلہ پر قین بن جسر کے خاندان نے حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں زید گرفتار ہو گئے۔ قین بن جسر کا خاندان انہیں عکاظ کے بازار میں لایا جہاں ان کو حکیم ابن حزام نے اپنی پھوپی خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے لئے خرید لیا۔ حضرت خدیجہ نے ان کو رسول اللہ صلعم کو پیش فرما دیا اور آپ نے انہیں آزاد کر دیا۔

حدیث میں ہے کہ حضرت علیؓ نے بیان فرمایا کہ صلح سے پہلے حدیبیہ کے دن مکہ کے کچھ غلام بھاگ کر رسول اللہ صلعم کے پاس چلے آئے اُن کے مالکوں نے آپ کو لکھا کہ یہ لوگ بخدا آپ کے دین کی طرف رغبت رکھنے کی وجہ سے نہیں بھاگے۔ بلکہ غلامی کی پابندیوں سے بھاگے ہیں۔ کچھ صحابہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ ان غلاموں کو واپس کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلعم اس مشورہ پر برافروختہ ہو گئے اور آپ نے ان کو واپس کرنے سے انکار فرما دیا[1]۔ زمانہ جاہلیت میں اور خود رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں یہ غلام عرب بھی ہوتے تھے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور غیر عرب یعنی کالے اور گورے دونوں طرح کے ہوتے تھے۔ گورے غلام ان ممالک کے ہوتے تھے جو جزیرۂ عرب کے اردگرد واقع تھے۔ بہت سے صحابی ایسے تھے جو غلام رہ چکے تھے مثلاً حضرت بلالؓ جو حبشی تھے، اور حضرت سلمانؓ جو ایرانی تھے اور حضرت صہیبؓ جن کا لقب رومی تھا، کیونکہ انہیں رومیوں نے ایلہ سے گرفتار کیا تھا اور روم میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلعم نے حسان بن ثابتؓ کو ایک باندی "سیرین" "تحفۃً" دی تھی۔ جن کے بطن سے عبدالرحمٰن بن حسان پیدا ہوئے تھے۔

غلامی کا یہ نظام رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں بھی جاری تھا۔ چنانچہ جو لوگ جنگوں میں گرفتار ہو کر آتے تھے آپ ان کے غلام بنانے کو جائز رکھتے تھے جیسا کہ غزوۂ بنی المصطلق میں ہوا تھا۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کو بنی المصطلق سے جو قبیلۂ خزاعہ کے عرب تھے — بہت سے قیدی ملے تھے جنہیں آپ نے مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا تھا۔

جب اسلام پھیل گیا تو عربوں سے سوائے اسلام یا جنگ کے

---

[1] ابوداؤد و ترمذی۔

کوئی صورت قبول نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے بعد عربوں کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی قیدی مسلمانوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو جاتا تھا تو اسے یا تو اسلام لانا پڑتا تھا اور یا اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔

فتوحات کی کثرت کے بعد اقوام مفتوحہ سے ہولناک حد تک لوگوں کو غلام[1] بنایا گیا اور یہ غلام بلا استثنا مرد، عورتیں اور بچے عرب فاتحین پر تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ مسعودی کا بیان ہے کہ حضرت زبیر ابن العوامؓ کے پاس ایک ہزار غلام اور ایک ہزار باندیاں تھیں۔

یہ غلام دیگر سامانوں کی طرح آقا کی ملکیت شمار ہوتے تھے اسے ان کو فروخت کر دینے اور ہبہ کر دینے کا حق ہوتا تھا۔ اگر باندی ہوتی تھی تو اس کے آقا کے لئے جائز ہوتا تھا کہ وہ اس سے جنسی تعلقات قائم کرلے۔

اس ملکیت میں کسی عدد کی قید نہیں تھی۔ ایک آدمی کے پاس کثیر تعداد میں غلام ہو سکتے تھے جیسا کہ اس کے حرم میں کثیر تعداد میں باندیاں[2] بھی ہو سکتی تھیں۔ اگر باندی کے بطن سے اس کے آقا کا کوئی بچہ پیدا ہو جاتا تو وہ آقا کا بیٹا ہوتا تھا اور اس کی ماں ام ولد کہلاتی تھی۔ وہ اس بچہ کے پیدا ہونے کے بعد بھی اپنے آقا کی ملکیت رہتی تھی اور وہ اس سے جنسی تعلقات برابر قائم رکھ سکتا تھا۔ لیکن اب اسے یہ حق نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے۔ آقا کے مرجانے کے بعد یہ باندی آزاد ہو جاتی تھی۔

اسلام نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کو واجب قرار دیا ہے اور مالک کو اس کی ترغیب دی ہے کہ وہ انہیں آزاد کر دے۔ اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کو بہت سے جرائم کا کفارہ بھی قرار دیا ہے[3]۔

مالک کو حق ہے کہ وہ اپنے غلام اور باندی کو آزاد کر دے یعنی انہیں پھر ان کی آزادی واپس کر دے۔ لیکن آزاد کنندہ اور آزاد کردہ غلام یا باندی میں پھر بھی ایک تعلق باقی رہتا ہے۔ اس تعلق کا نام "ولاء" ہوتا ہے۔ آزاد کردہ غلام یا باندی اپنے آزاد کرنے والے کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں زید ابن حارثہ مولیٰ رسول اللہ یعنی رسول اللہ صلعم کا آزاد فرمودہ۔ اگر یہ آزاد کردہ عورت ہوتی تھی تو اس کو مَولاۃ کہتے تھے۔ اس کی جمع مَوَالی ہوتی ہے۔ بعض اوقات آزاد کرنے والا جس قبیلے سے ہوتا تھا یہ مَوَالی اس قبیلہ کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ چنانچہ مولیٰ بنی ہاشم، مولیٰ ثقیف، وغیرہ لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی اسے یوں تعبیر کر دیتے تھے "ہاشمی بالولاء" "موسیٰ بالولاء" وغیرہ۔ اس تعلق کا اثر اس وقت ظاہر ہوتا تھا جبکہ آزاد کردہ غلام یا باندی بے اولاد اور بے وارث مرجاتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا آزاد کرنے والا اس کا وارث ہوتا تھا۔

عربوں میں اس حق ولاء کو فروخت کر دینے کا بھی رواج تھا۔

---

[1] رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں غیر عرب ممالک پر کوئی فوج کشی نہیں کی گئی جس سے یہ فرض نکالا جاسکے کہ غیر عربوں کو غلام بنانا تو بند ہو چکا تھا اور غیر عربوں کو غلام بنانے کا دستور رسول اللہ صلعم کے عہد میں باقی تھا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ سورۂ محمد کی مذکورہ بالا آیت نازل ہونے کے بعد غلامی قطعاً بند کی جا چکی تھی۔ نہ عربوں کی غلامی باقی رہی تھی نہ غیر عربوں کی۔ [طلوع اسلام]

[2] یہ ایک تاریخی چیز ہے، اور ہمیں اس پر تاریخی حیثیت ہی سے غور کرنا ہوگا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ایسا ہوا تو ظاہر ہے کہ یہ قرآن کے خلاف تھا۔ اسے اسلامی حکم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان حضرات پر قرآن کے خلاف عمل کرنے کی تہمت لگانے سے یہ کہیں زیادہ آسان ہے کہ تاریخ کے ان واقعات کو غلط قرار دیا جائے۔ (طلوع اسلام)

[3] یہ احکام انہی غلاموں کے متعلق تھے جو عربوں کے ہاں پہلے سے موجود تھے۔ (طلوع اسلام)

چنانچہ اغانی میں سائب خاثر کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ کسریٰ کے مالِ غنیمت میں سے تھے۔ اور عبد اللہ ابن جعفر نے اُن کے آزاد کرنے والوں سے ان کا ولاء خرید لیا تھا۔[1]

ولاء کی ایک دوسری نوعیت بھی ہوتی تھی۔ جس کا سبب آزاد کرنا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس کا سبب کسی آدمی کے ہاتھ پر کسی آدمی کا مسلمان ہو جانا ہوتا تھا۔ یہ دونوں آپس میں معاہدہ کر لیتے تھے کہ اس آدمی کا ولاء اس شخص کو حاصل ہو گا جس کے ہاتھ پر وہ مسلمان ہوا ہے۔[2]

قانونی طور پر ولاء کا نظام یہی کچھ تھا۔ البتہ تاریخی حیثیت سے اب نظر آتا ہے کہ "ولاء" کے یہ معنی زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں متعارف نہیں تھے بلکہ "موالی الرجل" آدمی کے حلیفوں اور ورثہ یعنی بنو اعمام، برادران، اور بقیہ عصبات پر بولا جاتا تھا۔ تفسیر طبری میں ہے کہ "ابن زید نے وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ موالی سے اس آیت میں عصبات مراد ہیں کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں انہیں ہی مَوَالِي کہتے تھے۔ اس کے بعد جب عجمی لوگ عربوں کے اندر داخل ہونے لگے تو ان کے ہاں ان کے لئے کوئی مناسب لفظ موجود نہیں تھا۔ قرآن کریم میں یہ ہدایت موجود تھی کہ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (اگر تمہیں ان کے آباد اجداد کے نام معلوم نہ ہوں تو پھر دین میں وہ تمہارے بھائی اور دوست و مددگار ہیں) اس کے مطابق عربوں نے ان کو مَوَالِي کہنا شروع کر دیا۔ ابن زید نے کہا کہ آجکل دو طرح کے مَوَالِي ہیں۔ ایک موالی تو وہ ہیں جو خود وارث ہوتے ہیں اور لوگ جن کے وارث ہوتے ہیں۔ یہ تو ذوی الارحام ہیں۔ اور دوسری قسم کے موالی وہ ہیں جو خود وارث نہیں ہوتے مگر لوگ ان کے وارث ہو جاتے ہیں۔ یہ آزاد کردہ غلام ہوتے ہیں"۔

ابن زید کے اس قول سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عجمی لوگوں پر لفظ موالی کا بولا جانا ایک ایسے نئے معنی ہیں جو زمانۂ اسلام ہی میں پیدا ہوئے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ خود رسول اللہ صلعم کے عہد میں بھی ان معنوں میں بولا جانے لگا تھا۔ کیونکہ۔ عام طور پر زید ابن حارثؓ کو مَوْلٰى رَسُوْلُ اللہ صلعم کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں بہت سی احادیث ایسی ملتی ہیں جن میں یہ لفظ انہی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے وَلاء کو فروخت کرنے سے منع فرمایا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ وَلاء کا رشتہ ایسا ہی ہے جیسا کہ نسب کا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن جب غلاموں اور آزاد کردہ غلاموں کی کثرت ہو گئی تو مَوَالِي کا لفظ آزاد کردہ غلاموں پر بولا جانے لگا۔ یہ آزاد کردہ غلام عربی عصبیت سے بہت کافی متاثر ہوتے تھے۔ ہر قبیلہ کے موالی اپنے قبیلہ ہی کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے اور جنگوں میں اپنے قبیلے کے ساتھ ہو کر نبرد آزما ہوتے تھے۔ قبیلہ کی ضروریات میں ان سے ہی خدمت لی جاتی تھی۔ باوجودیکہ اسلام کی دعوت یہ تھی کہ مسلمان (مسلمان) سب برابر ہیں۔ مگر اس کے باوجود عرب کے لوگ ـــــ خصوصیت کے ساتھ اُموی دورِ حکومت میں ـــــ ان موالی کو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھتے تھے جسے تحقیر کی نگاہ کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ موالی عام طور پر

[1] اغانی ص ۳۳۔ [2] یہ وہ دقیق معانی ہیں جو لفظ "مَوْلٰى" کے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ بہت سی ادب اور تاریخ کی کتابوں میں مَوَالِي کا لفظ ان تمام لوگوں کیلئے استعمال ہوا ہے جو اسلام میں داخل ہو گئے ہوں۔ خواہ وہ غلام بنائے گئے ہوں یا نہ بنائے گئے ہوں۔ کتبِ فقہ میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ زیلعی میں ہے کہ غیر عربوں کو موالی کہہ دیتے ہیں کیونکہ ان کے شہر عربوں کے ہاتھوں طاقت سے فتح ہوئے تھے۔ عربوں کو حق تھا کہ وہ طاقت سے غلام بنا لیتے مگر جب انہیں آزاد چھوڑ دیا تو گویا انہوں نے ان کو آزاد کر دیا۔ اور موالی آزاد کردہ لوگوں کو کہتے ہیں۔

بجوامیہ کو ناپسند کرتے تھے۔ اور یہیں سے موالی کی اپنی نئی عصبیت نے جنم لیا۔ تاریخ طبری میں مختار کے حملہ کے بارہ میں یہ اقتباس موجود ہے کہ

کوفہ میں شرفاء قوم جمع ہوئے اور مختار کے خلاف نکتہ چینی کرتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔ خدا کی قسم یہ شخص ہم پر زبردستی امیر بن بیٹھا ہے۔ اس نے آزاد کردہ غلاموں کو اپنا مقرب بنا رکھا ہے۔ انہیں گھوڑوں پر سوار کرتا ہے اور ہمارا مالِ غنیمت انہیں کھلا دیتا ہے یہ رنگ دیکھ کر ہمارے غلام نافرمان ہوتے جا رہے ہیں۔ اس طرح اس نے ہمارے یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کو بالکل ہی کنگال بنا دیا ہے۔ ..... (پھر کہتا ہے) ان لوگوں نے شبث بن ربعی کو اپنا نمائندہ بنا کر مختار کے پاس بھیجا جس نے اس سے جا کر کہا ــــ تو نے ہمارے آزاد کردہ غلاموں کو جو ہمارا مال غنیمت تھے بالکل ہی بگاڑ دیا ہے۔ وہ اور ان کے یہ سارے شہر ہمارا مال غنیمت تھے ہم نے انہیں آزاد کر دیا جس کے بدلہ میں ہمیں یقین ہے کہ ہمیں اس کا ثواب ملے گا اور ہمارا یہ عمل خدا کی بارگاہ میں مشکور ہوگا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم اتنے پر بھی راضی نہیں ہو کہ اب تم نے انہیں ہمارے مال غنیمت میں بھی شریک و سہیم بنا دیا ہے۔[1]

غالباً یہ واقعہ اس طرز نگاہ کی صحیح تصویر ہے جس سے عرب کے لوگ اس زمانہ میں اپنے ان آزاد کردہ غلاموں کو دیکھنے کے عادی تھے ابن عبد ربہ نے اپنی کتاب العقد الفرید میں نقل کیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے فرمایا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سُرخ رنگ کے لوگ (یعنی ایرانی اور رومی آزاد کردہ غلام) بہت زیادہ بڑھتے جا رہے ہیں ..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس دن کو دیکھ رہا ہوں جبکہ ان کی طرف سے عربوں اور عربوں کی سلطنت کے خلاف ایک زبردست ہنگامہ ہوگا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ان میں سے نصف تعداد کو تہ تیغ کر ڈالوں اور بعض نصف تعداد کو بازاروں اور راستوں کی آبادی کی خاطر زندہ رہنے دوں ..... مگر آگے چل کر وہ اپنی اس رائے سے ہٹ گئے۔[2]

غلامی اور دلاء کے اس نظام کا جس کا میں نے ذکر کیا ہے عربوں کی حیات عقلیہ پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ مفتوحہ ممالک کے بہت سے مرد اور عورتیں ــــ مالِ غنیمت کی طرح ــــ عربی فوج میں تقسیم کر دیئے گئے۔ تقریباً ہر سپاہی کے پاس کچھ نہ کچھ غلام اور باندیاں ہوتی تھیں جن سے وہ اپنی ضروریات میں کام لیتے اور اگر جی چاہتا تو باندیوں سے بچے بھی پیدا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی گھرانوں میں ایرانی، رومی، شامی، مصری اور بربری عناصر داخل ہوتے چلے گئے۔ عرب کا گھرانا خالص عربی گھرانا نہیں رہا بلکہ ایک معجون مرکب ہو گیا جس کا مالک محض عربی ہوتا تھا۔ اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ ــــ ان باندیوں سے جو بچے پیدا ہو رہے تھے ان میں دونوں خون ہوتے تھے۔ باپ کی طرف سے عربی خون اور ماں کی طرف سے اجنبی خون۔ اس قسم کے بچوں کی تعداد کچھ کم نہیں تھی اس لئے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں اور ان کے بعد عربوں کو بکثرت فتوحات حاصل ہوئیں جو زیادہ تر جنگ کرنیکے بعد حاصل ہوئی تھیں جن کے نتیجہ میں ان ممالک کے سپاہی اور باشندے گرفتار ہو کر آتے تھے حتیٰ کہ بڑے بڑے ذی وجاہت لوگ بھی گرفتار ہو جاتے تھے اور اس طرح ان پیدا ہونے والے بچوں کی

---

[1] العقد الفرید صفحہ

یہ تعداد روز افزوں ہوتی چلی جا رہی تھی۔ زمخشری نے اپنی کتاب "ربیع الابرار" میں بیان کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت عمرؓ کی خلافت میں جب ایرانی اسیرانِ جنگ کو لے کر مدینہ میں آئے تو ان اسیرانِ جنگ میں یزدگرد (شہنشاہ ایران) کی تین لڑکیاں بھی تھیں۔ لوگوں نے ان قیدیوں کو فروخت کر دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے یزدگرد کی بیٹیوں کو بھی فروخت کرنے کا حکم دیدیا تو حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شاہزادیوں کے ساتھ وہ سلوک تو نہیں کیا جا سکتا جو دوسرے عام لوگوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ پھر ان کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ان کی قیمت لگائی جائے اور جتنی قیمت ان کی لگے وہ کوئی شخص بیت المال کو ادا کر دے چنانچہ ان کی قیمت لگائی گئی اور حضرت علی نے وہ قیمت ادا کر کے ان تینوں لڑکیوں کو لے لیا۔ ان میں سے ایک لڑکی حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائی اور دوسری اپنے صاحبزادے حضرت حسینؓ کو اور تیسری حضرت محمد بن ابی بکر الصدیقؓ کو مرحمت فرمائی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ کے ہاں اس کے بطن سے سالمؒ پیدا ہوئے اور حضرت حسینؓ کے ہاں زین العابدین پیدا ہوئے اور محمد کے ہاں ان کے لڑکے قاسم پیدا ہوئے۔ یہ تینوں آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں اور ان کی مائیں یزدگرد کی بیٹیاں ہیں۔ بعض محققین نے اس میں شک کیا ہے کہ یہ تینوں لڑکیاں یزدگرد کی بیٹیاں نہ تھیں۔ لیکن بظاہر اس میں کوئی شک نظر نہیں آتا کہ ایرانی قوم کے کسی اچھے گھرانے کی لڑکیاں ہوں۔ مبرد کی کتاب "الکامل" میں ہے کہ مدینہ کے لوگ باندیوں کے پیٹ سے بچے پیدا کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر جب علی ابن الحسین اور قاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ بڑے ہوئے اور تینوں فقہ اور پرہیزگاری میں مدینہ منورہ کے دوسرے نوجوانوں سے فائق ثابت ہوئے تو لوگوں کو باندیوں کی طرف کافی رغبت ہو گئی۔

ان آزاد کردہ اور غیر آزاد کردہ غلاموں نے فتوحات کے بعد دوسری ہی نسل میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا کر دی جو سردارانِ تابعین اور بہترین مسلمانوں میں سے بلکہ اسلام میں علم کے علمبرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ حرکتِ علمیہ پر بحث کرتے ہوئے اس موضوع پر آئندہ ہم تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔

زندگی کے اہم مسائل کے متعلق

انسان نے کیا سوچا

؟

انسانی فکر کی دو ہزار سال کی تاریخ

از

پرویز

قیمت مجلد مع گرد پوش دس روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ـــــ کراچی ۳

باب المراسلات

کچھ دستور کے متعلق

گجرات سے ایک صاحب رقمطراز ہیں۔

ہفتاد و دو فرقے حسد کے عدد سے ہیں
لیکن یہ سب فرقے تو دشمن خرد کے ہیں

مبارک ہو کہ واضعین مسودۂ آئین جمہوریت اسلامی پاکستان نے پارٹ بارہ کی دفعہ چار میں اپنی تشریح کے ذریعہ سے مسلمانان پاکستان کے ہر فرقہ کو قرآن و سنت کی خود تعبیر کردہ تشریح و عقیدہ کے جواز کا قانونی حق دیکر اسلامی مساوات پر اپنی مہر تصدیق ثبت کرکے خوشنودیٔ عوام کے حصول کی وہ کوشش کی ہے۔ جس کی نظیر اس سے قبل کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جزاک اللہ۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس سے قبل تو جملہ فرقے اسلام میں خلاف تعلیم قرآن خود ساختہ ہی سمجھے جاتے تھے۔ بارے اب اسلامی قانون کے اجرا سے ان کی جداگانہ حیثیت کی تسلیم کا بندوبست تو ہو گیا ہے۔ اب فقط بہتر نہیں۔ بہتر ہزار فرقے بھی اگر اسلام میں پیدا ہو جائیں گے تو کوئی ان پر اعتراض نہ کریگا۔ آپ کو خصوصیت سے مبارک ہو کہ اب منکرین قرآن آپ کو منکر حدیث کہہ کر زمرۂ اسلام سے خارج کرنے کی جسارت نہ کرسکیں گے۔

البتہ چونکہ ابھی اس فراخدلانہ پیشکش پر عمل درآمد کے طریقہ کی جزئیات سامنے نہیں آئیں۔ اس واسطے بوقت تنازعہ مابین مختلف فرقہ جات کس فرقہ کی تفسیر قرآن و سنت کو صحیح اور کس کو غلط قرار دیا جاوے گا اور کس معیار کی روشنی میں۔ نیز اس مسلمہ حق کو ہر فرقہ میں متعین کرنے کے لئے ہماری گورنمنٹ کو ہر فرقہ کے آدمیوں کا ایک رجسٹر اور بہت بڑا عملہ رکھنا ضروری ہوگا تاکہ جس وقت بھی کوئی مسلمان ایک فرقہ کو چھوڑ کر دوسرے فرقہ میں شامل ہو جاوے۔ اس کا اندراج پھر سے رجسٹر فرقہ جات میں درست کر دیا جایا کرے۔ تکلیف اور خرچ تو بے حد ہوگا۔ لیکن فرقہ بندی کے اسلامی حقوق، مساوات کا مظاہرہ بھی تو کوئی چھوٹی بات نہیں۔

مولانا مودودی صاحب کے نظریۂ ارتداد کو اگر گورنمنٹ اپنالے۔ تو پھر اس مشکل کا حل اور بھی آسان ہو جائے گا۔ یعنی جس وقت کوئی شخص عقیدہ تبدیل کرے۔ اسی وقت اس کو قتل کر دیا جاوے۔ تاکہ باربار صحت اندراج رجسٹر کی زحمت سے تو چھٹکارا ہو جائے۔

اب قرآن مجید کی اکملیت اور صداقت کو اور بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ کیونکہ اس کے مدمقابل احادیث۔ روایات۔ قیاسات اور فقہ کے بے شمار لشکر قانون ملکی کی پناہ میں اس پر یورش کردیں گے۔ اور بالآخر اس پر حکم بن جائیں گے۔ خدا آپ کو اور ہم کو جو فقط

قرآن مجید کو ہی اپنی زندگی کا ماہ نما سمجھتے رہے ہیں اس دن تک زندہ رکھے یا نہ رکھے۔ آپ کی اس بارہ میں کیا رائے ہے۔ مہربانی کرکے مطلع فرمایئے تاکہ اس کے مطابق دعا مانگنے کا التزام کیا جائے۔

آجکل ایک کمیشن آزادانہ اور منصفانہ رائے دہندگی کے متعلق ایک سوالنامہ کے ذریعہ سے پبلک کی رائے دریافت کر رہا ہے۔ کیا آپ نے اس سوالنامہ کے جوابات لکھے ہیں۔ اگر لکھے ہیں تو ان کو طلوع اسلام میں شائع فرما دیں گے یا نہیں۔

دوسرا کمیشن میرج لاز کے سلسلہ میں ایسا ہی سوالنامہ شائع کر چکا ہے۔ قرآنی نکتہ نگاہ سے آپ اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس پر بھی توجہ فرمائیں گے۔

تیسری بحث اخبارات میں اور خصوصاً پاکستان ٹائمز لاہور میں حقوق نسواں پر چل رہی ہے۔ جس میں خواتین کے حامی ان کو ہر شعبۂ زندگی میں مردوں کے مساوی حقوق دلانے کی تگ و دو میں ہیں۔ کیا قرآن مجید بھی ان کی تائید کرتا ہے۔ بے شک خواتین کا ہم سے بے حد قریبی تعلق بطور ماں۔ بہن۔ بیوی۔ اور بیٹی کی شکل میں ہے اور ان کی خوشنودی اور بہتری ہم کو دل سے مطلوب ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جاوے۔ کہ حق میراث میں عورت کا حصہ مرد سے نصف مقرر اور ایک مرد کے بالمقابل دو عورتوں کے گواہ بنانے کا حکم بھی موجود ہے۔ اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ اگر ایک عورت بھول جاوے تو دوسری اس کو یاد کرا دے۔ یعنی عورت کی یادداشت بمقابلہ مرد کے نصف ہی اعتبار کی گئی ہے۔ علاوہ ان قدرتی کمزوریوں یعنی ایام ماہواری کی تکلیف اور وضع حمل کی مجبوریوں کی موجودگی میں عورتیں بائی کورٹوں کی جج یا فوجی کمانڈ کے فرائض کو کس حد تک بروقت سرانجام کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اور یہ کمزوریاں اور مجبوریاں مرد کی پیدا کردہ بھی نہیں کہ ان کا الزام اس کو دیا جاوے۔

کیا کوئی ایسا مطالبہ جو قرآن مجید کے صریح احکام کے برخلاف ہو۔ تاویلات کی مدد سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور کیا بیک وقت دعوئے اسلام اور مطالبات مذکورہ یک جا جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ تو یک بام و دو ہوا والا معاملہ ہے۔ امید ہے کہ جناب کسی فرصت میں اس مسئلہ پر پورے قرآن کی روشنی میں نہ کہ صرف چند مطلب کی آیات کی تاویل حسب منشا کرکے جیسا کہ آجکل اخبارات میں ہو رہا ہے۔ اپنی مؤقر رائے طلوع اسلام کے ذریعہ سے عوام تک پہنچانے کی مبارک سعی فرمائیں گے۔

طلوع اسلام

(۱) مسودۂ دستور پاکستان پر، طلوع اسلام کا تفصیلی تبصرہ، اس کی اشاعت بابت فروری ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ دیگر متعلقہ امور پر تبصرہ اشاعت حاضرہ میں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

(۲) منصفانہ رائے دہندگی سے متعلق کمیشن کا سوالنامہ ہم تک نہیں پہنچا۔

(۳) عائلی زندگی کے متعلق کمیشن کا سوال نامہ اور اس کے جوابات اشاعت حاضرہ میں پیش خدمت ہیں۔

(۴) قرآن کی رُو سے عورت کی صحیح پوزیشن کے متعلق "طاہرہ کے نام خطوط" میں تفصیلی طور پر لکھا جا چکا ہے۔ ان میں یہ تمام نکات آ گئے ہیں۔ جن کا ذکر مکتوب زیر نظر میں کیا گیا ہے۔

(۵) کوئی ایسا مطالبہ جو قرآن کریم کے صریح احکام کے خلاف ہو، کسی تاویل و تفسیر کی رو سے بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ طلوع اسلام

اسے انتہائی بددیانتی اور تلاعب بالدین سمجھتا ہے کہ قرآن کی حسب مطلب آیات کی تاویل تو قرآن کہہ کر پیش کیا جائے اور جو آیات اپنے مطلب کے خلاف جائیں ان سے چشم پوشی کرلی جائے۔ یہ تو بلکہ بددیانتی سے بھی بڑھی ہوئی بات ہے۔

فردوسِ گم گشتہ

از پرویز

ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات قیمت فی جلد چار روپے

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱۳ء۔ کراچی

نقد و نظر

(۱) جدید شعرائے اردو

یہ سوا گیارہ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جو سفید کاغذ پر نہایت عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے۔ جلد مضبوط اور بڑی خوبصورت ہے ڈسٹ کور بھی دیدہ زیب ہے۔

"فیروز سنز" نے جس محنت اور ہمت سے اسے چھاپا اور شائع کیا ہے وہ یقیناً داد کے قابل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اٹھارہ روپے میں کچھ بھی مہنگی نہیں۔ البتہ اس میں ایک چیز ایسی ہے جو اس کے صوری محاسن کے لئے ایسی ہی سمجھئے جیسے پرانے زمانے میں کسی عمدہ عمارت پر کالی ہنڈیا لٹکادی جاتی تھی۔ کتاب میں قریب قریب ہر شاعر کی تصویر بھی شامل ہے لیکن یہ تصاویر اس انداز کی ہیں کہ آپ جانے پہچانے ہوئے شاعروں کو بھی بہت کم پہچان سکیں گے۔ بلکہ بعض تصاویر تو بالکل مضحکہ انگیز ہو گئی ہیں۔ جو کتاب ٹائپ میں چھپے اس میں تصاویر کے بلاک، تصاویر سے بہتر نہیں تو تصاویر جیسے ضرور چھپنے چاہئیں۔ لیکن اس کتاب میں یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان تصاویر کو بگاڑا کس طرح سے گیا ہے؟ اس تنقید سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اگر اس میں تصاویر بھی صحیح انداز سے چھپتیں تو صوری حیثیت سے اس کتاب کو اردو کی عمدہ کتابوں میں شامل کیا جاسکتا تھا۔

کتاب کا تعارف خود ناشرین نے کتاب کے ٹائٹل پر ان الفاظ میں کرایا ہے "اردو ادب میں جدید شاعری کے بانیوں، مولانا آزاد اور حالی سے لے کر عہدِ حاضر تک کے مستند اور صاحبِ طرز شاعروں کے سوانح حیات۔ کلام پر بے لاگ تبصرہ اور انتخاب کلام اس تعارف سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ موضوع کس قدر وسیع ہے۔ چنانچہ کتاب میں ایک سو بارہ شعراء کے حالات زندگی اور ان کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ متقدمین میں آزاد۔ حالی۔ شبلی نعمانی اسماعیل میرٹھی۔ اکبر الٰہ آبادی اور علامہ اقبال کے نام نظر آتے ہیں۔ متوسطین کا طبقہ قریب ۸۵ شعراء پر مشتمل ہے۔ اور متاخرین میں جگر مراد آبادی سے لے کر حیا لکھنوی تک کے نام ہیں۔ اس کے بعد قریب پندرہ شعرائے نئی پود کے ہیں۔ ان طبقات کی تقسیم کسی خاص اصول کے ماتحت نہیں کی گئی۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا ہے کہ ان سب کو جدید شاعری کا بانی کس طرح قرار دیا گیا ہے مثلاً بیخود اور سائل دہلوی یا ثاقب اور آرزو لکھنوی کونسی جدید شاعری کے بانی ہیں؟ اور ویسے تو یہ سوال بھی خود فیصلہ طلب ہے کہ "جدید شاعری" کہتے کسے ہیں؟ وہ جسے علامہ اقبال نے پیش کیا یا وہ جسے ادبِ لطیف کے نام سے عام کیا جارہا ہے اور جس میں نہ شاعری ہوتی ہے نہ جدت!

یہاں تک تو زیرِ نظر کتاب کا تعلق تھا۔ لیکن ہماری شاعری کے متعلق اتنی ضخیم کتاب کے سامنے آنے سے طبیعت پر جو اثر طاری تھا

وکرنا مرتب ہوتا ہے وہ بڑا ہی افسوسناک ہے۔ شعراء اگر تمام کے تمام تعلیم یافتہ نہیں تو پڑھے لکھے ضرور ہوتے ہیں۔ اس احساس سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہماری قوم کا یہ لکھا پڑھا طبقہ کن باتوں میں اپنی زندگی ضائع کر رہا ہے۔ سوائے ایک آدھ مستثنیات کے (کہ جس میں کسی زندگی بخش پیغام کو موزوں اسلوب کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے) باقی ہر مقام پر آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات ایک فرضی دنیا میں بستے ہیں اور اس کے فرضی قصے کہانیاں بیان کر کے خوش ہو جاتے ہیں کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ایک فرضی معشوق ہے۔ کبھی فرضی طور پر اس کے وصل سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور کبھی فرضی طور پر اس کے ہجر میں آہیں بھر رہے ہیں۔ کہیں فرضی رقیب ہے جس سے چشمکیں ہو رہی ہیں۔ اس معشوق کی فرضی راہ گذاریں ہیں جن میں انہیں کسی نہ کسی طور خیال ہی خیال میں برسوں سے شام کرنا اور فرضی رہروؤں کی فرضی جوتیاں کھانا ہے۔ ان کی ساری شاعری کا تجزیہ کیجئے تو سو پچاس لفظوں کی الٹ پھیر کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ آپ سوچئے کہ جس قوم کا لکھا پڑھا طبقہ برسوں سے اس قسم کے بیکار شغلوں میں اپنی زندگی بسر کرے اور قوم کے ہزاروں لاکھوں لکھے پڑھے لوگوں کو ٹڈی دل کی طرح اپنے پیچھے لگائے لگائے پھرے وہ قوم زندگی اور اس کی توانائیوں سے کبھی بہرہ مند ہو سکتی ہے؟ ہم سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے دور غلامی میں جب قوم کے سامنے کوئی عملی پروگرام نہیں تھا اس قسم کے بیکار شغلے پنپ رہے ہیں لیکن آزادی ملنے کے بعد قوم کے سامنے ہزاروں کرنے کے کام آ گئے تو اس قسم کے بیکار شغلوں کی فرصت نہیں ملے گی لیکن ہماری اس ہشت سالہ زندگی نے یہ بتایا کہ آزادی ملنے کے بعد ہماری حالت اس رئیس زادہ کی سی ہو گئی جس کا باپ اس کی تعلیم و تربیت کئے بغیر لاکھوں روپے کی جائیداد ترکہ میں چھوڑ مرے۔ چنانچہ اگر صرف شاعروں ہی سے اندازہ لگایا جائے تو ہم ایک ہی زقند میں، بہادر شاہ اور واجد علی کے زمانے میں جا پہنچے۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس قسم کی کتابیں قوم کے لئے اور بھی نقصان رساں ہیں۔ اگر "فیروز سنز" اتنی محنت اور کاوش ان لوگوں کے حالات زندگی اور کارناموں کی تفاصیل کو یکجا کرنے میں صرف کرتا جنہوں نے کائنات انسانی زندگی کے مختلف گوشوں میں عملی تحقیقات سے نئی نئی چیزیں دریافت کیں اور اس طرح یہ کوششیں نوع انسانی کے لئے نفع رساں ثابت ہوئیں تو یہ کام فی الواقعہ قوم کے لئے فائدہ کا موجب بنتا۔

(۲) ہمایوں (سالنامہ)

اردو ادب کا مشہور ترجمان ماہنامہ ہمایوں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پہلے یہ خالص ادبی پرچہ ہوا کرتا تھا لیکن وہ ایک سال ادھر سے اس کے مدیر میاں بشیر احمد صاحب نے (جو اپنے سینے میں ایک دل درد مند رکھتے ہیں) اس میں ایک تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی اور نئے ادب اور اخلاق کا امتزاجی مجموعہ بنانا چاہا اس باب میں ہمارا نقطہ نگاہ تو یہ ہے کہ

یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

لیکن یہ بھی کیا ضرور ہے کہ ہر شخص اس نقطہ نگاہ سے متفق ہو۔ ہمارے ادبی جرائد و مجلات کا رخ اگر تدریجی طور پر بھی صحیح منزل کی طرف مڑ جائے تو ہم اسے غنیمت سمجھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمایوں کی یہ کوشش قابل تعریف ہے۔ اگرچہ اس کا یہ انداز خود اس مسلک کا ہمدوش نہیں جو "ہمایوں" کے زیب دہ عنوان ہوتا ہے اور جس میں تلقین یہ کی جاتی ہے کہ

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

زمانے "دو قدم" کا ہے۔ آہستہ خرامی کا نہیں۔

(۳) وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے

ہمارے محب عزیز ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب حیدرآبادی حلقہ طلوع اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دو تین برس ادھر ان کی ایک کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا (THE MIND WHICH AL-QURAN BUILDS) اس کتاب پر طلوع اسلام میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ جو حضرات انگریزی نہیں جانتے ادران کے دل میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات کی قدر ہے ان کی آرزو اور تقاضہ تھا کہ اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ شائع ہو جائے۔ چنانچہ ان تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز حیدرآباد دکن نے کتاب کا اردو ترجمہ شائع کر دیا ہے۔ ترجمہ عبد القیوم خاں باقی (ایم اے۔ ایل ایل بی مرحوم) کا کیا ہوا ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں لیکن اگر درج ہوتی بھی تو اس کا کچھ فائدہ نہ تھا اس لئے کہ کتاب غالباً پاکستان میں کہیں سے نہیں مل سکے گی۔ اور ہندوستان سے انفرادی طور پر کتابیں منگانے میں جو دشواری ہے اس کا ہر ایک کو علم ہے۔

۴۔ "سینہ زوری"

آپ حیران ہوں گے کہ یہ کونسی کتاب ہے جس پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ یہ کسی کتاب کا نام نہیں بلکہ کتاب چھاپنے والوں کے طرز عمل کا تعارف ہے۔ حیدرآباد دکن میں ایک صاحب ہیں امیر ولایت علی، انہوں نے ادارۂ علمیہ کی طرف سے محترم پرویز صاحب کی کتاب "اسلامی معاشرت" شائع کی ہے جس کے لئے انہوں نے مصنف کی اجازت ضروری سمجھی نہ ادارۂ طلوع اسلام کی، جس کی طرف سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ پھر سینہ زوری یہ کہ کتاب کو تبصرہ کے لئے طلوع اسلام ہی کے پاس بھیجا ہے۔ اسلامی معاشرت تو انہوں نے لفظ بلفظ چھاپ دی ہے۔ لیکن ادارہ کی طرف سے پرویز صاحب کی دوسری کتاب "اسباب زوال امت" کا خلاصہ شائع کیا ہے۔ یہ بھی مصنف اور ادارۂ طلوع اسلام کی اجازت اور علم کے بغیر کیا گیا ہے۔ ہمیں قانونی پوزیشن کا تو علم نہیں کہ پاکستان کی کتابیں ہندوستان میں مصنف یا ناشرین کی اجازت کے بغیر چھاپی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ البتہ قانون اخلاق کا تقاضا ضرور ہے کہ ایسی کتابوں کی اشاعت سے پہلے مصنف اور ناشرین کی اجازت لے لی جائے کس قدر افسوس ہے کہ ہم لوگوں میں اخلاقی ضوابط کی اتنی سی رعایت بھی باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس یورپ کے "ملحدین" کی یہ کیفیت ہے کہ اگر کوئی مصنف خود اپنے کسی ایسے مضمون کو اپنی کتاب میں شامل کرنا چاہے جو پہلے کسی رسالہ میں شائع ہو چکا ہو، تو وہ اس رسالہ سے اس کی اجازت حاصل کرتا ہے۔

PRINCIPLES OF MENTAL HEALTH

ہمارے زمانہ میں (MENTAL HEALTH) نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے اردو زبان میں اس کا صحیح ترجمہ مشکل ہے (MENTAL) کے معنی ہیں (MIND) سے متعلق اور چونکہ (MIND) ایک ایسا لفظ ہے جس کا مرادف لفظ اردو میں نہیں مل سکتا۔ اس لئے (MENTAL) کا ترجمہ بھی مشکل ہے۔ ہمارے ہاں ذہن۔ قلب۔ نفس کے الفاظ ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک لفظ بھی وہ مفہوم ادا نہیں کرتا جو انگریزی زبان میں (MIND) کا لفظ ادا کرتا ہے (MENTAL HEALTH)

سے مراد ہے انسان کے قلب اور دماغ، خیالات اور اطوار، سیرت و کردار کا صحت مند اور متوازن ہونا۔ یا یوں سمجھئے کہ انسانی ذات یا شخصیت کی حسن کارانہ انداز سے نمود۔ مغربی ممالک میں اس مقصد کے لئے بڑی بڑی سوسائٹیاں قائم ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے سامنے انسانی ذات کا صحیح تصور نہیں، اس لئے وہ اس باب میں سائیکولوجی سے آگے نہیں بڑھ سکے جو سائیکلوجی کی ایک شاخ ہے۔ ان کی تقلید میں مشرقی ممالک میں بھی اس مقصد کے لئے بڑی بڑی سوسائٹیاں قائم ہوئی ہیں، جن کا مقصد (MENTAL HEALTH) کو ترقی دینا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک سوسائٹی کراچی میں بھی قائم ہوئی ہے۔ اس سوسائٹی کے پریذیڈنٹ، کراچی کے سیول سرجن لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر منظر حسین شاہ ہیں۔ شاہ صاحب ایک سائنٹسٹ کے دماغ کے ساتھ سینہ میں ایک صحیح مسلمان کا قلب رکھتے ہیں۔ ان کے اس قلب و دماغ کے امتزاج سے زیر نظر پمفلٹ ظہور میں آیا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مغرب میں صحتِ نفس کے لئے کچھ ہی قوانین کیوں نہ ہوں، مسلمانوں کے ہاں اس کی بنیاد اللہ کے صحیح تصور پر قائم ہوتی ہے۔ اس سے ان کی مراد کسی سسٹم کا باطنی تصوف نہیں۔ بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ صحیح متوازن اور صحت مند شخصیت وہ ہے جس میں صفات خداوندی کی نمود ہو اور اسلامی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ افراد کے اندر ان صفات کو منعکس کرتا چلا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اس پمفلٹ میں قدم قدم پر قرآنی آیات درج کی ہیں۔ اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن ہی وہ راستہ ہے جس سے مذہب اور سائکولوجی میں صحیح ربط پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اس پمفلٹ کے حرف حرف سے متفق ہو اس میں اختلاف کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے اور خود ہمارے نزدیک بھی اس کے بعض مقامات محل نظر ہیں۔ لیکن شاہ صاحب نے اس باب میں جو داغ بیل ڈالی ہے وہ یقیناً لائق صد تحسین ہے۔ اگر ہمارے ہاں کے سائنسدان اپنے اپنے شعبوں میں اسی طرح سے قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو وہ دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ اسلام چند رسوم و معتقدات ہی کا نام نہیں بلکہ وہ مختلف علوم کی دنیا میں عقل انسانی کی صحیح راہ نمائی کا کام دیتا ہے۔ یہ پمفلٹ جو (پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف منٹل ہائی جین کراچی) کی طرف سے شائع ہوا ہے غالباً علمی حلقوں میں بلا قیمت تقسیم کے لئے ہے۔ بہرحال ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں ان کی اس پہلی کوشش پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے اس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کردہ دو اور پمفلٹ بھی آئے ہیں۔ یہ پمفلٹ انسٹی ٹیوٹ کے ممبر، زاہد حسین صاحب کے ایک مقالہ اور ایک خطبہ پر مشتمل ہیں۔ ایک پمفلٹ میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں صحتِ نفس کے مسائل کیا ہیں۔ اور دوسرے میں انہوں نے کہا ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے باشندوں میں صحتِ نفس کی بنا پر خوشگوار اور پختہ تعلقات کس طرح پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کی یہ کاوشیں حوصلہ افزائی کی سزاوار ہیں۔

نظامِ ربوبیت

از پرویز

قیمت:۔ قسم اوّل چھ روپے
قسم دوم چار روپے